مقالہ

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات

۲۰ فروری ۱۹۰۱ء سنہ عیسوی

نوٹ:-

۱۹۰۱ء میں مسٹر جسٹس راناڈے آنجہانی کے مشورہ اور اون کی امداد سے مسٹر سی۔ وائی چنتامنی نے ہندوستان کی اصلاح معاشرت پر ایک مجموعہ مضامین شایع کیا تھا۔ اس مجموعے میں معاشرتی اصلاح کے مختلف پہلوؤں پر چودہ طبعزاد مقالات تھے، جن کے لکھنے والے ڈاکٹر بھنڈارکر، آنریبل مسٹر انند اچارلو، مسٹر کین، مسٹر دیارام گیڈومل مسٹر مدہولکر، وغیرہم تھے۔ تجویز یہ تھی کہ مسٹر راناڈے آنجہانی اس مجموعہ پر ایک مقدمہ لکھیں گے جو جملہ مقالات کے مباحث پر حاوی ہوگا لیکن بدقسمتی سے ان کی قبل از وقت وفات کی وجہ سے یہ تجویز بروئے کار نہ آسکی چونکہ اب یہ مجموعہ خارج از طباعت ہوچکا ہے، اس لئے اکثر احباب کے اصرار پر "ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات"، پر ذیل کا مضمون جو انہی چودہ مقالات میں شامل تھا علیحدہ طور پر مکرر شائع کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد دکن
۲۸ر اپریل ۱۹۲۵ء

ا-ح

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات

میرے زمانہ طالب علمی میں یہ مسئلہ کہ معاشرتی اصلاح مقدم ہے یا سیاسی اصلاح، ایک نہایت دلچسپ موضوع بحث تھا۔ اور اخبارات میں اور تقریروں میں اس پر خوب بحثیں ہوا کرتی تھیں مسٹر جسٹس تلنگ آنجہانی نے طلبائے بمبئی کی بزم ادبی و علمی (Students' Scientific and Literary Society) کے ایک جلسہ میں اس پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا، جو اب تک میرے دل پر نقش ہے۔ اس مقالہ میں سنجیدہ معقولیت، اصابت فکر، اور حُسنِ ادا کی وہ تمام صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں جو آنجہانی کا طغرائے امتیاز تھیں، اور جن سے قبل از وقت محروم ہو جانے کا صدمہ اب تک ہم سب کے دلوں میں ہے۔ ہمارے نظام العمل کا وہ جُز جو اس مقالہ کا عنوان ہے، ہر دلیل سے زیادہ اس امر کا عملی ثبوت ہے کہ معاشرتی اصلاح کو اگر سیاسی اصلاح پر تفوق نہیں تو کم از کم زیادہ اہمیت ضرور حاصل ہے۔ جیسا کہ میں کئی موقعوں پر کہنے کی جسارت کر چکا ہوں، یہ امر واقعہ ہے کہ جب تک محکوم طبقہ کے دو بڑے فریقوں میں باہمی حسد اور بدظنی باقی ہے۔ اس وقت تک حکومت بھی مجبور ہے۔ ان دونوں قوموں کی یہ آپس کی مخالفت۔ جو حال میں کئی مرتبہ ہنگاموں اور بلوؤں کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہے۔ اور جس کا انسداد ہمارے پیش نظر سیاسی مسائل میں سے خاص الخاص مسئلہ بن گیا ہے۔ ہمارے ملک، اور ہماری مشترکہ جنم بھومی کی ترقی کے راستہ میں سنگِ گراں ہے۔" .... تاوقتیکہ ہم (مسلمان)

اس کو بخوبی ذہن نشین نہ کرلیں گے کہ ہم اور اہلِ ہنود ایک ہی رشتۂ وحدت میں منسلک ہیں، اور ہمیں اپنی فلاح و بہبود کے لئے مل جل کر جد وجہد کرنا ہے۔ اُس وقت تک سیاسی اصلاحات کی ہماری ہر کوشش بے کار، اور ہر سعی، سعیٔ غیر مشکور ثابت ہوگی۔"

نفسِ اصلاح کا تقاضا ہی کثرت میں وحدت چاہتا ہے اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپس میں اتفاق اور یک جہتی ہو۔ یعنی منفرد اور مختلف الاجزاء وحدتوں کو سمو کر ایک ایسے متحد الجنس مجموع کی شکل میں ترتیب دینا جو اپنے ماحول کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو یہ ماحول اگرچہ گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتا ہے، لیکن وہیں تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ نسل اور ملت اور وطن کے تعینات کو سمیٹتا ہوا وسیع سے وسیع تر ہوجاتا ہے، حتیٰ کہ کل بنی نوع انسان اور ساری کائنات پر حاوی ہوجاتا ہے۔ اس اعتبار سے مصلح معاشرت کا دائرۂ عمل پیغمبر کی حدِ عمل کے ہم کنار ہوجاتا ہے جو "دنیوی آسودگی اور کل بنی نوع انسان کے ساتھ حسنِ سلوک" کی منادی کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو "ہندوستانی مصلحان معاشرت" کے نظام العمل کے مختلف اجزاء "سیاسی شورش پسندوں" (اس لفظ سے تنقیص مدنظر نہیں ہے) کے مزعومہ مطالبات حقوق یا تعباصوفی جدوجہد کی ساری شگوفہ کاریاں (یہاں تعباصوفی کے وسیع ترین معنے مراد ہیں۔ کسی خاص ادارے کی طرف اشارہ نہیں ہے۔) ان سب کی کل اہمیت اور ان کا تمام تر جواز صرف اسی قدر ہے کہ یہ سب گویا قدم ہیں جو اکثر بہت رک رک کر، اور عموماً غیر ارادی طور پر اُٹھتے ہیں لیکن ہمیں بتدریج اس منزلِ مقصود کے قریب کرتے رہتے ہیں، جو اگرچہ ابھی بہت دور ہے، لیکن جہاں پہنچ کر ہم عورتیں اور مرد سب خود دار بن جائیں گے اور ہمارا ملک ریاست ہائے وفاقیہ برطانیہ کے دوسرے خود مختار اجزا کی طرح اور ان ہی کے

دوش بدوش جگہ پانے کا مستحق ہو جائے گا۔

اگر بالآخر ہماری یہ اُمید بر نہ آئی تو سمجھنا پڑے گا کہ ہندوستان کی عنان شہنشاہیت کا ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں جانا جو اپنی سیرت، تاریخ، اور روایات کے اعتبار سے اقوام ہند کی تعلیم اور ان کے احیاء کے لئے (بمقابلہ دیگر اقوام عالم) سب سے زیادہ موزوں تھی گویا ایک بے منشاء اور بے مقصد چیز تھی، خصوصاً جب یہ یاد رکھا جائے کہ شہنشاہیت کی منتقلی کا یہ عمل اس قدر غیر شعوری طور پر، اور بظاہر علی الرغم حالات و خواہشات واقع ہوا ہے کہ مذہبی خیال کے لوگوں کو صریحاً اس کی تاریخ میں مشیت الٰہی کا رفرما نظر آتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وحدت اور ہم آہنگی کی وہ زبردست قوتیں جن کا ذکر میں نے کیا ہے، برطانوی اقتدار ہی کی رہین منت ہیں، بلکہ ان کا تصور، اور اُن کے حصول کا امکان بھی اسی اقتدار کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ قوتیں کیا ہیں؟ حقیقی امن عامہ، مساوی قوانین، غیر جانبدارانہ عدالت، بعد مکانی مٹاتے والی ریلیں، وقت کو مسخر کرنے والی تار برقی، اور ان سب سے بھی بڑھ کر اخلاق آفرین اور ولولہ خیز ادبیات جس نے اکابر عالم کے افعال، اقوال، اور حالات کے دروازے ہم پر کھول دئے ہیں۔

دوسری طرف بادی النظر میں یہ معمّا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ گویا اسی برطانوی اقتدار کی وجہ سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں اختلاف باہمی کے کچھ نئے اجزا بھی پیدا ہو گئے ہیں، یعنی ایسے اجزا جو فی نفسہٖ اہمیت سے خالی ہیں، لیکن ان کا اثر بہت زیادہ لیا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو تعلیم کو حصول ملازمت کا واحد معیار نہیں تو بھی خاص معیار بنا دینے سے ہندؤں کو اس اثر و اقتدار کے حاصل کرنے میں، جو پہلے انہیں سوائے مغربی ہندوستان کے اور کہیں حاصل نہ تھا، فائدہ پہنچا ہے۔ اور اسلامی فتوحات ہندوستان کے ان تعصب آمیز

اور رائج الوقت بیانات کو پڑھ کر جنہیں بدقسمتی سے تاریخ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی نئی نسلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر وہ پرانے بدلے لئے جائیں (صاف بیانی معاف ہو) جو اُن کی رائے میں محمود غزنوی کے زمانہ سے لے کر اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان کے زمانے تک باقی ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں میں جو اپنی آنکھوں کے سامنے اثر و اقتدار کو مٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، وہ بیزاری جو پہلے انگریزوں کی طرف سے تھی اب ہندوؤں کے ساتھ پیدا ہوتی جا رہی ہے جو اس دوڑ میں اُن سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ایک طرف تو ہندوؤں میں اسلامی عہد حکومت کے جو پہلو سب سے زیادہ قابل اعتراض تھے ان کی تلخ یاد اور اس سے پیدا ہونے والا شدید جذبۂ انتقام، اور دوسری طرف مسلمانوں کا برابر سرکاری ملازمتوں سے محروم ہوتے جانا (جو زیادہ تر خود انہی کی عدم قابلیت توافق کا نتیجہ ہے) اور اس سے پیدا ہونے والا جذبہ حسد یہ دو اجزاء باہمی نفاق کے خاص الخاص اسباب ہیں، اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جن علاقوں میں اسلامی اثر کم پائدار رہا ہے، یا جہاں کاروبار تجارت، جس سے سرکاری ملازمت کے مقابلہ کی تیزی کم ہو جاتی ہے سب سے زیادہ بڑھا ہے۔ وہاں دونوں قوموں کے تعلقات اور سب علاقوں سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ اگر یہ جواب دیا جائے کہ ان علاقوں کے مسلمان باعتبار سیرت، نسل اور احساسات ہندوؤں ہی کی طرح ہیں تو یہ واقعہ کہ انگریزی تعلیم کی ترویج نے انہیں اپنے ہندو بھائیوں سے کسی قدر جدا کر دیا، ہماری مذکورۂ بالا رائے کا مزید ثبوت ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان مرکز گریز قوتوں کے اثر کو زائل کس طرح کیا جائے ؟ سطور ذیل میں میں نے بعض ایسے عوامل کا ذکر کیا ہے جس سے میری رائے میں یہ مطلب حاصل ہو سکتا ہے

اور اگر میرا روئے سخن زیادہ تر ہندوؤں کی طرف ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں گذشتہ حالات کا زیادہ تر ذمہ دار انہیں قرار دیتا ہوں، نہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ بحیثیت تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ اکثریت ہونے کے مستقبل کے بارے میں ان کی ذمہ داری زیادہ ہے، اور دونوں قوموں میں رابطۂ اتحاد پیدا کرنے کی طرف موثر ترین اقدام وہی بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلا عامل ملکی پریس ہے۔ اسے اس امر کا حقیقی احساس ہونا چاہیئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی خوش گوار تعلقات کا ہونا بدرجۂ اتم ضروری ہے۔ آج کل تو ایک دوسرے کے مطالبات پر تلخی اور بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کرنے کا رجحان بہت بڑھا ہوا ہے۔ خاص طور پر یہ سلوک ہندو پریس کی جانب سے مسلمانوں کے مطالبات کے ساتھ کیا جاتا ہے جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ اکثر صورتوں میں یہ مطالبات غیر واجبی اور مبالغہ آمیز ہوتے ہیں اور ناگوار طریقہ پر پیش کئے جاتے ہیں، لیکن میری رائے یہ ہے کہ ان صورتوں میں بھی زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تحمل اور ہمدردی سے کام لے کر، مبالغہ آمیزی اور بے باکی کی نرمی کے ساتھ اصلاح کر کے مطالبات کو زیادہ واجبی اور کم تند آمیز پیرایہ میں پیش کرنے کے طریقے بتائے جائیں۔ مثلاً مسلمانوں کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ اعلیٰ تر ملازمتوں میں ان کی نمایندگی زیادہ ہونی چاہیئے۔ اب یہ صریحی بے انصافی کی بات ہے کہ کسی ایک اسلامی انجمن کے مطالبہ کو یہ کہہ کر اچھالا جائے کہ مسلمان تو یہ چاہتے ہیں کہ داخلہ ملازمت کا معیار ان کے لئے کم کر دیا جائے، اور اس چیز کو نہ دیکھا جائے کہ ذمہ دار اسلامی انجمنوں کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ براہ راست اور باقاعدہ طور پر ایک مخصوص تعداد میں ایسے مسلمان گریجوٹیوں کو ملازمتیں دی جائیں جن کے پاس یونیورسٹیوں کی، یا ان کالجوں کی جہاں انہوں نے تعلیم پائی ہے۔ یا ایسے افسرانِ سررشتہ کی جن کی ماتحتی میں انہوں نے کام سیکھا ہے،

باقاعدہ تصدیق اور سندیں ہوں مختصر یہ کہ پریس میں اتنی وسیع النظری ہونی چاہیئے کہ وہ ایک کم ترقی یافتہ جماعت کے اغراض و مفاد کو سب جماعتوں کے مفاد کا لازمی وسیلہ اور تتمہ سمجھے

۲- یہی اُصول ہر اجیر کے بھی، خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، پیشِ نظر رہنا چاہیئے اسے اپنے جملہ ماتحتین کے مفاد کی پوری نگہداشت کرنی چاہیئے اور از رُوئے انصاف ترقی وصلہ کارگزاری کے بارے میں کسی قسم کے اثرات قبول نہ کرنے چاہیئیں۔ اسے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنے دفتر کو اس اتحادِ قلبی کا (جس کا میں خواستگار ہوں) مرکز استحکام یا محل انتشار بنانا اس کے ہاتھ میں ہے۔ استحقاق کی ایک حق تلفی، یا ایک مستحق امیدوار فضل و کرم کی امداد، اس مقصد نیک کو برباد کرنے، یا ترقی دینے میں متعدد تقریروں یا مقالوں سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے۔

۳- ابھی حال میں شمالی ہندوستان میں اُردو ہندی کا جو تلخ قضیہ کھڑا کیا گیا ہے اُس کی روشنی میں، میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں جس سے بجائے کبیدگی کے حقیقی محبت پیدا ہو سکتی ہے۔ میں لسانی حیثیت سے اس مسئلہ کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا اور نہ اُس سے بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا جو موجودہ حل اختیار کیا گیا ہے، اس سے ان لوگوں کو جو اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ کس حد تک فائدہ ہو گا۔ اگرچہ یہ خیال ایک حد تک قرینِ قیاس ہے کہ اگر موجودہ صورت حال ہی قائم رہتی تو اس سے مشترکہ زبان کا مقصد جو ہر شخص کو عزیز ہے، پورا ہو جاتا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس تبدیلی سے جن فوائد کی اُمید ہو سکتی ہے وہ اس رنجش و کدورت کو دیکھتے ہوئے جو دلوں میں پیدا ہو گئی ہے، گراں پڑے ہیں۔ موجودہ صورت حالات سے ہندوؤں کو جو دقتیں ہوتی تھیں وہ سات برس پہلے کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تو نہیں تھیں، اور جہاں تک مجھے علم ہے، اس زمانے میں یہ مسئلہ اٹھایا تک نہیں گیا تھا

لیکن اس واقعہ سے دونوں قوموں کے درمیان۔ جو بعض مخالف اثرات کے مٹ جانے کی وجہ سے، اور اس سے بھی زیادہ قحط اور وبا کے مشترکہ سبق آموز مصائب کا شکار ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ جدائی کی ایک خلیج حائل ہو گئی ہے جس کے بھرنے میں برسوں گذر جائیں گے۔ جب ایک قوم کے جذبات مشتعل ہو گئے ہوں تو کیا ایسی صورت میں دوسری قوم کے قائدین کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مفاد عامہ اور خیر بشیتر کے اصول کو سامنے رکھ کر از خود مجوزہ تبدیلی کے التواء کی خواہش کریں، خصوصاً جب کہ اس تبدیلی سے ایک دیرینہ صورت حال میں خلل واقع ہوتا ہو؟ اگر صرف اس ایک مسئلہ میں یہ نقطۂ نظر اختیار کیا جاتا، تو کیا اس سے دوسرے متعدد مسائل بحسن و خوبی طے نہ ہو جاتے، کیوں کہ ایک قوم کا تھوڑی سی قربانی برداشت کر لینا، اس کی حقیقی خواہش دوستی کو دوسری قوم پر ثابت کر دیتا ہے ۱۸۸۷ء کی کانگریس منعقدہ مدراس میں مسٹر جسٹس طیب جی کی تحریک پر یہ قرارداد منظور ہوئی تھی کہ جس مسئلہ کو کوئی ایک قوم غلبہ آرا سے اپنے مفاد کے منافی سمجھے اس پر کوئی بحث نہ ہونی چاہیئے میری رائے میں ہمارے جملہ قائدین کو بھی اسی قسم کی کسی قرارداد کو قبول کر کے اس پر پوری طرح کاربند ہونا چاہیئے۔

۴۔ ایک اور امر جس کی طرف میں توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ حالیہ رجحان ہے جو فرقہ وارانہ ادارات خصوصاً قوم کے مختلف طبقوں کے لئے جداگانہ مدارس اور کلیات قائم کرنے کے بارے میں دیکھا جا رہا ہے۔ مسز بیسنٹ کا بنارس کا ہندو کالج اس رجحان کی جدید ترین مثال ہے۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت سے غافل نہیں ہوں کہ کسی خاص قوم کی اپنی مخصوص ضروریات کا انتظام ہونا چاہیئے،

لیکن میں ایسے ادارات کے قیام کو جن سے دوسری قوموں کے افراد کو دور رکھا جائے قابل افسوس سمجھتا ہوں۔ علی گڑھ کالج سے ہندوؤں کو علیحدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے کتنا اچھا ہوتا اگر بنارس کالج بھی اسی روشن خیال پالیسی پر کاربند ہوتا! مدارس اور کالجوں کی جمہوریت ہی اور سب چیزوں سے کہیں زیادہ، فرقہ وارانہ اختلافات اور امتیازات کو مٹاتی ہے۔ اور اس کا اثر قومی زندگی کے وسیع تر میدان پر بھی پڑتا ہے۔ مدرسوں کالجوں میں دوستی اور محبت کے جو رابطے مستحکم ہوتے ہیں وہی سب سے زیادہ موثر طریقہ پر ہر طبقہ اور ہر ملت کے تعلیم یافتہ افراد میں باہمی مفاہمت اور یگانگت پیدا کرتے ہیں۔ انجمن اصلاح معاشرت Social Reform Conference کی قسم کی تحریکیں بھی اسی صورت میں مفید تر ہو سکتی ہیں جب طبقہ وارانہ مجالس میں ہر فرقہ کی مخصوص ضروریات پر غور کرنے کے بعد، ہندو اور مسلمان نمائندوں کی ایک مشترکہ مجلس میں مشترک خامیوں، اور عام اصولوں پر بھی غور و خوض کیا جائے۔

۵۔ اتفاق و اتحاد کی جانب ایک اور قدم اس طرح اٹھایا جا سکتا ہے کہ دونوں قومیں باقاعدہ طور پر اور بالارادہ اس ضرورت کو تسلیم کر لیں کہ انہیں عملی حیثیت سے ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا پاس اور لحاظ کرنا چاہیئے مثلاً کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان قائدین حتی الامکان گاؤکشی کی روک تھام کی عملی کوشش نہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قربانی کچھ ایسی زیادہ سخت نہ ہوگی، لیکن اس سے مسلمانوں کے مفاد کے ساتھ جو ہمدردی پیدا ہو جائیگی وہ نہایت قابل قدر ہوگی۔ دوسری طرف کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسجدوں کا بجا طور احترام کرنے کے بارے میں ہندو قائدین اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ شرکت عمل نہ کریں۔

۶۔ سب سے آخری، لیکن سب سے زیادہ نتیجہ خیز عامل ادبیات ہے۔ آجکل

ہندوؤں کی اکثر تصانیف ہیں، ہر قسم کی مذہبی بے حرمتی، بدعملی، اور برائی کا اتہام مسلمانوں پر رکھا جاتا ہے اس بارے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے سب سے بڑے مفکر کے (جس کی وسعت ذہنی سارے ہندوستان کے احیاء پر حاوی ہے اور جس کی تقریریں ہر سال اس احیاء کے مختلف پہلوؤں پر یکے بعد دیگرے اس قدر بصیرت افروز روشنی ڈالتی رہتی ہیں) لکھنؤ کے خطبہ کو پیش نظر رکھ کر تحقیقات کے جو فاضلانہ اسلوب اس میں بتائے گئے ہیں، ان پر مزید کام کریں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہو گا کہ تاریخ ہند پر ایسی مناسب نصابی کتابیں تیار ہو جائیں گی جن میں اسلامی فتوحات ہند پر ہمدردانہ بحث ہو گی، اور مسلمانوں نے ہندی تہذیب کے فروغ میں جو حصّہ لیا ہے وہ ظاہر ہو گا۔ اور اس طرح دونوں قوموں کی باہمی کدورت کا شدید ترین سبب جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے، مٹ جائے گا۔

نفاق انگیز اثرات کو زائل کرنے کے لئے جو علاج ہو سکتے ہیں ان میں سے صرف چند سطور بالا میں پیش کئے گئے ہیں۔ اگر اس مسئلہ پر اس قدر توجہ صرف کی جائے جتنی باعتبار اس کی اہمیت کے ہونی چاہیئے تو بلا شبہ اور کئی علاج بھی سمجھ میں آ سکتے ہیں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میری رائے میں ایک ہندوستانی کا مقدس ترین فرض یہ ہے کہ وہ اس وسیع براعظم میں بسنے والی مختلف نسلوں اور قوموں کے دلوں کو ایک ہی رشتۂ اتحاد میں منسلک کر دے، یہ اتحاد صرف یہی نہ ہو، کہ ہندو اور مسلمان اور پارسی، اور عیسائی ایک دوسرے کے وجود کو گوارا کرنے لگیں، یا ایک شان بے تعلقی کے ساتھ رہیں، نہیں، بلکہ ایک زندہ اور عملی اتحاد ہو، ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں جو سب اپنی مشترکہ ودیعت کے فروغ کے لئے یک جہتی اور یگانگت کے ساتھ سرگرم عمل ہوں۔

تقریر

محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس

سترہواں سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی

۲۹ر دسمبر ۱۹۰۳ء

جنٹلمین۔

میرے نزدیک کانفرنس کے کانسٹی ٹیوشن میں اصلاح کی نہایت ضرورت ہے اس کہنے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے، کہ کانفرنس بالفعل کوئی فضول اور بے کار چیز ہے بلکہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کانفرنس تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرتی ہے، اور ان کو اتفاق اور اتحاد کے ساتھ کام کرنے کا سبق سکھاتی ہے، مگر کانفرنس کے لئے زیادہ مستقل زیادہ علمی اور زیادہ مقررہ کام کرنے کا اب وقت آگیا ہے۔ تمام مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا اور خیالی رزولیوشن پاس کرنا، کافی نہیں۔ میں ایسا کانسٹی ٹیوشن چاہتا ہوں جو مسلمانوں میں تعلیمی نقائص پر غور کرے، اور سمجھے، اور ان کو دُور کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کانفرنس ایک ہی خیال اور ایک ہی پالیسی کے لوگوں کی جولانگاہ ہو، بلکہ اُس میں مختلف خیالات اور پالیسی کے لوگ بھی شریک ہوں۔ اور کاروبار میں حصہ لیں۔ اس لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ انتظامی انجمن کے انتخاب کے طریقوں میں اصلاح کی جائے۔ فنڈ جمع کرنے اور اس کے مناسب انتظام اور تحویل کے لئے صاف اور ضروری قاعدے بنائے جاویں۔ میں چاہتا ہوں کہ اصلاح تمدن کا معاملہ کانفرنس سے علیحدہ نہ کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جو اصلاح اس رزولیوشن کے ذریعہ سے ہوگی وہ نہایت دانشمندانہ اور کافی طور پر وسیع ہوگی۔

خطبۂ صدارت

مجلسِ تعلیمی حیدرآباد دکن

یکم مارچ سنہ ۱۹۱۵ء

حضرات!

یہ بہت نازک اور پرخطر وقت ہے۔ یورپ میں ایک خونخوار اورخونریز جنگ ہورہی ہے۔ جس سے ایک عالم میں ماتم بپا ہے۔ ہزاروں لاکھوں بندگان خدا بےوجہ وبے گناہ قتل کئے جارہے ہیں اور ساری دنیا میں ایک تشویش اور ہنگامہ مچا ہوا ہے لیکن اس تاریکی میں صرف ایک جھلک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بحیثیت رعایا کے اپنے فرض کو بکمال بخوبی انجام دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیحضرت حضور انور خلد اللہ ملکہٗ نے اپنی پرخلوص دوستی کا حق ادا کردیا جو انہیں اپنے آبائے کرام سے ارثاً ملا ہے ہمیں خدائے ذوالجلال پر پورا بھروسا ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے گا اور جبر واستبداد کو پائمال کرے گا۔ اس لئے یہاں نہ بدامنی ہے اور نہ بےچینی اور پورا اطمینان حاصل ہے اور اس اطمینان کی ایک دلیل یہ ہے کہ ہم آج اس نیک کام کو شروع کرنے والے ہیں اور اس تعلیمی مجلس کا آغاز کرنے کو ہیں جس سے ہمارے ملک کی فلاح اور ہماری امیدیں وابستہ ہیں اور ہم سب کو اعلیحضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہٗ کا تہ دل سے شکرگزار ہونا چاہیئے کہ ازرہ مراحم خسروانہ اس مجلس کے انعقاد کی منظوری عطا فرمائی۔

اس کے بعد میں اپنا دلی رنج اور افسوس اس ملکی اور قومی صدمے پر ظاہر کرتا ہوں جو اس سال ہندوستان کو محبت قوم شکر گو کھلے۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی ڈاکٹر رگھوناتھ کی وفات سے پہنچا ہے میرا یہ اظہار رنج محض رسمی بحیثیت میر مجلس کانفرنس کے نہیں ہے بلکہ درحقیقت میرا دل اس پرالم حادثہ سے پاش پاش ہے۔ مجھے تینوں بزرگوں کی خدمت

میں نیاز حاصل تھا اور جب مجھے اُن کی وفات کا خیال آتا ہے تو میرا دل بھر آتا ہے اور اس بھرے جلسہ میں کون ایسا ہے جسے اُن محسنین ملک کی وفات پر حقیقی رنج والم نہ ہو کیا ہم اتنے بڑے ملک میں کسی ایک شخص کا نام بھی بتا سکتے ہیں۔ جس نے اپنے ملک کی ایسی بے ریائی اس قدر خلوص اور ایثار کے ساتھ خدمت کی ہو اور جس نے اپنے ملک کی خاطر اپنی جان و مال اور عزت سب کچھ قربان کر دیا ہو مجھے مسٹر گوکھلے کے دُوسرے خیالات سے بحث نہیں لیکن جو بے نظیر تعلیمی خدمت اونھوں نے کی ہے اور جو ایثار و خلوص کا نمونہ اونھوں نے پیش کیا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ کیا ہم اپنی قوم میں مولانا حالی کی نظیر پیش کر سکتے ہیں۔ جس نے اُردو ادب میں ایسا انقلابِ عظیم پیدا کیا ہو جس کے پُر درد نغموں نے اہلِ ملک کو خوابِ غفلت سے اس طرح جگایا ہو اور جس کی پاک سیرت اور اعلیٰ خصائل کا ایسا عجیب و غریب اثر ہوا ہو؟ کیا کوئی ہمیں اس وقت ڈاکٹر رگھوناتھ سے بڑھ کر علم یا طالب علموں کا سچا دوست بتا سکتا ہے کیا اس وقت مولانا شبلی کی کوئی مثال ہمارے ملک میں موجود ہے۔ جس نے اپنی ساری عمر علمی تحقیقات میں صرف کی ہو۔ جس نے تاریخِ اسلامی کا ایسا صحیح ذوق ملک میں پیدا کیا ہو اور جس نے آخر دم تک اسی علمی دُھن میں اپنی عمر صرف کر دی ہو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان تینوں محسّنان وطن نے اپنی ہمت اور کوشش اور عمر کا بڑا حِصّہ تعلیم کی تشویق اور اشاعت میں صرف کیا جو بنیاد ہے تمام ترقیوں اور بہبودیوں کی۔ یہ تینوں غریب خاندان کے تھے عمر بھر غریب اور قلیل معاش رہے لیکن جو کام انہوں نے کئے ہیں اور جو عزت انہیں دُنیا میں حاصل ہے کیا کوئی لکھپتی اور کروڑپتی اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو دُنیا کا نمک اور عالم کی روشنی کہلاتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں

جن کی زندگی قابل تقلید ہے ہم سب کو اون کی وفات کا رنج اور صدمہ ہے لیکن ہماری سعادت مندی اس میں ہے کہ ہم اون کی پاک زندگی اور اُن کے خلوص اور ایثار سے سبق حاصل کریں۔

حضرات! میں آپ صاحبوں کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اس تعلیمی مجلس کے قیام سے ملک پر ایسا بڑا احسان کیا ہے کہ جس کا شکریہ نہ صرف ہم بلکہ آئندہ نسلیں بھی ادا کریں گی۔ میری رائے میں اگر اس ملک کے لئے سب سے بہتر، سب سے مفید اور سب سے اعلیٰ کوئی کام ہو سکتا ہے تو وہ ایک ایسی ہی تعلیمی مجلس ہے اگرچہ یہ کام بہت پہلے شروع ہونا چاہیئے تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بہت دیر کی ہے لیکن اس تاخیر کی تلافی ہم اپنی مستعدی، جفاکشی اور محنت سے کر سکتے ہیں۔ اور اگر یہ کام اسی جوش اور مستعدی کے ساتھ جاری رہا تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے نتائج کیسے عمدہ اور اُس کے اثرات کیسے بے بہا پیدا ہوں گے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اس مجلس کی صدارت کے لئے کسی صاحب علم و فضل کا انتخاب کیا جاتا جو اس خدمت کو مجھ سے بہتر اور زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دیتا۔ مجھے علم و فضل کا ہرگز دعوے نہیں ہے۔ اور یہ میں بغیر کسی انکسار اور تصنع کے کہتا ہوں۔ لیکن میں علم کا خدمت گزار ضرور ہوں اور اس ناچیز خدمت گزاری پر مجھے فخر ہے۔ میرا دلی منشا ہے کہ اس ملک میں تعلیم عام ہو اور علم کی روشنی سے سارا ملک منوّر ہو جائے۔ مجھے ابتدائے ملازمت سے جہاں جہاں میں رہا تعلیم سے خاص دلچسپی رہی۔ اور میں نے اپنی بساط کے موافق ہمیشہ اس میں حصہ لیا۔ اور جب سے میں اس ریاست میں ہوں مجھے سب سے زیادہ خیال تعلیم کا رہا۔ اور جب تک میں رہوں گا میں ہمیشہ اس کی ترقی کو مدنظر رکھوں گا۔ اس لئے

جو عزت کہ آپ نے مجھے اس مجلس کے اجلاس اوّل کی صدارت کی بخشی ہے اس کا میں تہ دل سے ممنون ہوں اور اس موقع کو میں اپنی زندگی میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ یاد رکھوں گا۔

حضرات! علاوہ ان اعلیٰ خوبیوں اور نیکیوں کے جو ہمیشہ عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ ہر زمانہ میں بلحاظ ضروریات وقت اور اقتضائے زمانہ بہت سی دوسری ایسی چیزیں اور بہت سے دوسرے ایسے کام میں جن کی قدر و منزلت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اون کا درجہ نیکی اور ثواب تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر اس زمانے کے حالات اور ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو اشاعتِ تعلیم اور علم پھیلانا درحقیقت نیکی اور ثواب کا کام ہے اور اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ **جہاد** کا کام ہے۔ کیا جہالت و ظلمت سے جنگ کرنا تاریکی کو رفع کرنا اور علم کی روشنی پھیلانا **جہاد** نہیں ہے خصوصاً ایک ایسے ملک میں جہاں تعلیمی حالت پست ہے جہاں علم مفقود ہوتا جاتا ہے اور جہاں ابھی لوگوں کو علم کی پوری قدر نہیں ہے اور جہاں آپ کو یہ سن کر سخت تعجب معلوم ہوگا کہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ایک ہزار میں صرف (۲۸) ہے یعنی سو میں ۸ء۲ یہ خوشی اور شکر کی بات ہے کہ گذشتہ دس سال میں حیدرآباد کی آبادی نے قابل لحاظ اور معتدبہ ترقی کی ہے لیکن جب آبادی کی ترقی کے مقابلہ میں تعلیمی حالت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بجائے ترقی کے اس کی تعداد چار کس فی ہزار گھٹ گئی ہے۔

اگر آپ قرب و جوار کے انگریزی صوبوں اور ریاستوں سے مقابلہ کریں گے تو اس سے صاف معلوم ہوگا کہ ہم کس قدر پیچھے ہیں۔ اور اس مقدس کام کے لئے کس قدر

جان توڑ کر کوشش کرنی چاہیئے۔ ملاحظہ ہو۔

ٹراونکور	میں فیصدی لکھے پڑھے	۱۵
بڑودہ	"	۱۰ر۱
مدراس	"	۵ر۷
بمبئی	"	۷
میسور	"	۳ر۶
ممالک متوسط و برار	"	۳ر۳
ریاست حیدرآباد	"	۸ر۲

میں نے اس تفاوت کے دکھانے کے لئے ایک ڈائی گرام تیار کیا ہے، جو اس وقت آپ کے سامنے ہے اور جس سے ایک نظر میں ہماری تعلیمی حالت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے گا کیا یہ حالت قابلِ حیرت، قابلِ افسوس اور قابلِ شرم نہیں ہے؟ سررشتۂ تعلیمات کو الزام دینا آسان ہے، لیکن کیا ملک کے تعلیم یافتہ اور دیگر باخبر اصحاب کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اس سررشتہ کو مدد دیں اور تعلیم کی اشاعت میں مختلف طور سے کوشش کریں؟

اگرچہ سررشتۂ تعلیم اس خاص غرض سے سرکار نے قایم کیا ہے۔ لیکن درحقیقت تعلیم ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے لئے کوشش کرنا تمام سررشتوں، تمام تعلیم یافتہ اور ملک کے بہی خواہ اصحاب کا فرض ہے۔ کیا رعایائے ممالک محروسہ سرکار عالی ہندوستان کے دوسرے حصص کے باشندوں سے زیادہ کم سمجھ زیادہ غبی اور ناقص الذہن ہے؟ یہ ممکن نہیں اور اس لئے اس کمی کے اسباب ہیں دوسری جگہ

تلاش کرنے چاہیئیں۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیمی لحاظ سے خاص شہر حیدرآباد کی حالت بہت قابل اطمینان ہے۔ اور اگر اس کا مقابلہ اضلاع سے کیا جائے تو حیرت انگیز ہے۔ تقریباً بیس فیصدی خواندہ اشخاص میں سے ستر فی صدی انگریزی پڑھے لکھے اور ۱۸ فی صدی خواندہ عورتیں ہیں۔ لیکن کیا ممالک محروسہ سرکار عالی سے مراد صرف شہر حیدرآباد ہے؟

مگر جب ہم اعلیٰ تعلیم کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو جو مسرت ہمیں بلدہ کی تعلیمی حالت سے ہوئی تھی وہ مبدل بہ افسوس وحسرت ہو جاتی ہے۔

حضرات! حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اور اس کے بیان کرنے سے بھی شرم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس سے میرا مقصد کسی کو الزام دینا نہیں بلکہ میرا منشا اس سے یہ ہے کہ ارکان کانفرنس جنہوں نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، وہ ابھی سے سمجھ لیں کہ ان کے سامنے کیسا بڑا کیسا اہم اور کیسا دشوار اور کٹھن کام ہے۔ اور ابھی سے انہیں ان موانعات کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو ہمارے رستہ میں حائل ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو سارے ملک میں بلدہ ہی ایک شہر ہے اور بلاشبہ یہ بہت بڑا شہر ہے لیکن اس کے سوائے ملک کے دوسرے بہت کم ایسے مقامات ہیں جن میں شہریت کے آثار پائے جاتے ہوں اور یہی وجہ ہے کہ وہاں تعلیم کی ضرورت اس قدر محسوس نہیں ہوئی ہے۔ شہروں کے ترقی پانے اور بڑھنے سے قصبات اور پھر دیہات پر اثر پڑے گا۔ چنانچہ بلدہ کا جو اثر اس کے قرب وجوار پر پڑا ہے اس سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ تمام اضلاع ممالک محروسہ میں صرف اطراف بلدہ اور میدک ایسے ضلع ہیں جہاں لکھے پڑھے لوگوں کا اوسط تمام ریاست کے اوسط کے برابر بلکہ اس سے کچھ زائد ہے

اور یہ صرف بلدہ کا اثر ہے۔

اس کے علاوہ تجارت ایک ایسی چیز ہے۔ جو تعلیم کی ممد اور اس کی ترقی کا باعث ہوتی ہے جوں جوں ریلوں اور سڑکوں کی توسیع ہوگی اور ذرائع آمد و رفت سہل ہوتے جائینگے تجارت کو فروغ ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کو بھی ترقی ہوگی۔ چنانچہ جن مقامات پر پہلے ریل نہ تھی اور اب ہوگئی ہے۔ وہاں تجارت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی بڑھتی جاتی ہے جس کی ایک نظیر پربھنی ہے۔

تیسرے اس ملک کی رعایا زیادہ تر زراعت پیشہ ہے اور تقریباً ۶۲ فی صدی اشخاص زراعت یا اس کے متعلقہ پیشوں میں مصروف ہیں اور انہیں ابھی تک تعلیم کی ضرورت اور فوائد محسوس نہیں ہوئے ہیں۔

چوتھے۔ جاگیرات میں تعلیم کی طرف بہت کم بلکہ مطلق توجہ نہیں کی گئی، جس کا اثر ملک کے اوسط پر پڑتا ہے۔

پانچویں ایک وجہ تعلیم کی کمی کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہمارا مقرر کردہ نصاب تعلیم خصوصاً اضلاع اور دیہات کی ضروریات یا وہاں کے لوگوں کی طبائع اور خواہشات کے مناسب نہو۔

چھٹے، نیچ اقوام۔ جن کی ایک کثیر تعداد یہاں آباد ہے اور بلحاظ تعداد کے ہندو مسلمانوں کے بعد انہیں کا درجہ ہے تعلیم کی نعمت سے بالکل محروم ہیں۔ ان کی تعلیم کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی ایسے اسباب ہوں گے جو اب تک اشاعت تعلیم کے مانع رہے ہوں اور جہاں تک میری نظر نہ پہنچی ہو۔ لیکن میری رائے میں بہت بڑی کمی

سچے جوش اور خلوص کی ہے۔ اگر کام کرنے والوں میں سچا جوش اور خلوص ہو اور دلوں میں درد ہو تو رفتہ رفتہ سب موانعات خود بخود اٹھ جائیں گے۔ اس لئے اس کانفرنس کا کام صرف یہی نہ ہوگا کہ وہ بلدہ میں اپنے اجلاس کرے اور دل خوش کن تجاویز پر بحث کرکے انہیں منظور کرے بلکہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرنا ہوگا۔ واقعات اور حالات پر غور کرکے صحیح نتائج قائم کرنے ہوں گے اور مشنریوں کی طرح ایثار سے کام لینا پڑے گا۔ اس وقت اس کا کام مقبول ہوگا اور یقیناً سرکار اس کے نتائج پر غور کرے گی اور ان سے معتد بہ فائدہ اٹھائے گی اگر کانفرنس نے یہ کام کرلیا تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے ایک ایسی بڑی مہم سر کی جس کے اثرات دور تک پہنچیں گے اور موجودہ اور آئندہ نسلیں ہمیشہ اس کی رہین منت رہیں گی۔

سررشتۂ تعلیمات کی رپورٹوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خانگی مدارس کی تعداد بہ نسبت سابق کے کم ہوتی جاتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ صحیح اعداد دستیاب نہ ہوئے ہوں لیکن اغلب یہی ہے کہ ان کی تعداد میں سرکاری مدارس قائم ہونے کی وجہ سے کمی ہوگئی ہے اور مشکل یہ آپڑی ہے کہ چونکہ ہمارا مقرر کردہ نصاب تعلیم ان کی ضروریات اور خواہش کے مطابق نہیں اس لئے وہ لوگ اپنے بچوں کو ہمارے مدارس میں بھیجنے میں تامل کرتے ہیں اور خانگی مدارس کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ایک وجہ ان کی جہالت ہے کہ وہ سرکاری تعلیم کی قدر نہیں کرتے اور خانگی مدرس انہیں مغالطہ دے کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ دوسرے ان کا خیال بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ ہم نے اپنے نصاب میں اُن کی خواہشات کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا۔ اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مدارس دیہی کے نصاب میں زیادہ سختی نہ کی جائے اور اس طور سے مرتب کیا جائے کہ اہل دیہہ کی خواہشات کا لحاظ بھی رہے اور تعلیم کی غایت بھی پوری ہو اور ایسا ہونا ناممکن نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ

سررشتۂ تعلیم میں جو اصلاح نصاب تعلیم کے متعلق تجاویز ہو رہی ہیں اس میں اس امر کا لحاظ کیا گیا ہے یہاں اس امر کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ تمام ہندوستان میں عام تعلیم کے لحاظ سے سب سے بہتر حالت برما کی ہے۔ جہاں خواندہ اشخاص فی صد (۲۲) سے زائد ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں خانگی مدارس (بدھ خانقاہوں میں) بکثرت ہیں اور اس لئے یہ کہنا کسی طرح بے جا نہیں کہ اس ملک میں خواندہ اشخاص کی کمی خانگی مدارس کی تعداد گھٹ جانے سے ہوئی ہے۔ اگر ہم نے ان کی طرف سے غفلت کی ہے تو اب ضرور ہے کہ ان کا قائم مقام پیدا کر کے اس نقصان کی تلافی کریں۔

یہ چند اسباب ہیں جو میرے خیال میں اشاعت تعلیم کے مانع ہیں۔ ممکن ہے کہ اور بھی بہت سے اسباب ہوں اور ضرور ہوں گے جن پر میری نظر نہیں پڑی اور جن میں ہمارے قدیم روایات سوشیل حالت اور توہم پرستی کو بہت کچھ دخل ہوگا۔ یہ اب کانفرنس کا کام ہے کہ ان کی تلاش کرے ان پر غور کرے اور ایسی تجاویز عمل میں لائے جو موانعات کو اٹھا دیں اور اشاعت تعلیم کا رستہ نکالیں۔ کانفرنس کی یہ تجاویز بلا شبہ قابل قدر ہوگی۔

لیکن، حضرات! جہالت کی جڑ اس وقت تک نہیں کٹ سکتی، جب تک علم کی اشاعت ہماری عورتوں اور لڑکیوں میں نہ ہو وہ ملک اور قوم کبھی تعلیم یافتہ اور شائستہ نہیں ہو سکتی جس کے مرد تو علم حاصل کریں اور عورتیں علم سے بے بہرہ ہیں گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک جسم ایسا ہے جو نصف تو صحیح سالم ہے اور نصف مفلوج ؟ بچوں پر ماں باپ دونوں کا اثر ہوتا ہے لیکن یہ مسلّم ہے کہ ماں کا اثر باپ سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں تو کیا اس کے ساتھ یہ بھی مانتے ہیں کہ جاہل اور بے علم ماں کا اثر بچے پر اچھا پڑے گا ؟ اگر وہ گودیں! جن میں ہماری اولادیں پرورش پاتی ہیں۔ جہاں وہ اخلاق و مذہب کا پہلا سبق سیکھتی ہیں،

جہاں اوّل اوّل اون کا کیرکٹر بنتا ہے، علم سے خالی ہیں، تو پھر ہم کیونکر یقین کرسکتے ہیں کہ جب ہماری اولادیں اُن گودوں میں سے پرورش پا کر بڑھیں گی تو وہ حقیقی علم و اخلاق سے آراستہ ہوں گی؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں جہالت کا زور ہے، علم کی کمی ہے اور تعلیم کی طرف سے عام بے توجہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جن خاندانوں کے مرد تعلیم یافتہ ہوگئے ہیں ان کی عورتوں میں بھی علم کا چرچا ہوتا جاتا ہے لیکن یہ کہنا کہ جب مرد تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو وہ عورتوں کی تعلیم کا خود بخود انتظام کرلیں گے۔ ایک قسم کا مغالطہ اور دہوکا ہے کیا اس کی کوئی حد مقرر ہے؟ کیا اس کی کوئی مدت معین ہے؟ کیا اس وقت تک انتظار کرنا عقل کی بات ہے؟ اور کیا ہم اس نقصان عظیم کو چپکے بیٹھے سہا کریں۔ جو اس مدت مدید اور اس انتظار شدید میں ہماری نسلوں کو پہنچنے والا ہے؟ اصلاح دونوں کی یکساں اور ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے کیوں کہ دونوں پر ہمارے خاندانوں کی بقا اور آئندہ نسلوں کی اصلاح منحصر ہے۔

حضرات! یہ وقت تعلیم نسواں کے فوائد اور نقصانات پر بحث کرنے کا نہیں ہے بحثوں کا وقت گزر چکا۔ اب عمل کا زمانہ ہے۔ ہمیں اب کچھ کرکے دکھانا چاہیئے۔ موجودہ کی اصلاح اور آئندہ کی فکر ہونی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ وقت لاطائل بحثوں میں گزر جائے اور ہمیں آئندہ نسلوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ مجھے یہ ذکر کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس ملک میں خواندہ عورتوں کی تعداد ہزار میں صرف ۸ ہے۔ اور اگر بلدہ کو خارج کردیا جائے تو یہ تعداد فی ہزار ۲ ۱/۲ ہی رہ جاتی ہے۔ جو نہایت قابل افسوس ہے۔ کانفرنس کو یہ امر مدنظر رکھنا چاہیئے کہ وہ اگر اپنے ملک کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتی ہے تو تعلیم نسواں کی سب سے زیادہ فکر کرے۔ اس ملک میں خواندہ اشخاص کی جو کمی دکھائی

گئی ہے یعنی فی ہزار ۲۰۸ تو اس کی بڑی وجہ ہے کہ عورتیں تعلیم میں مردوں سے بہت پیچھے ہیں اور اس کمی کا اثر عام اوسط پر پڑا ہے اگر عورتوں کو خارج کردیا جائے تو خواندہ مرد فی ہزار ۱۵۰ ہوں گے۔ لیکن کیا ہم اس حساب میں عورتوں کو خارج کرسکتے ہیں؟ اور کیا بغیر عورتوں کے ملک تعلیم یافتہ ہوسکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس اس مسئلہ کی اہمیت پر کامل غور کرے گی تعلیم کے ہر شعبہ کی اصل ابتدائی تعلیم ہے۔ اور اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس کی ترقی و اشاعت میں سعی کرنا ہمارا سب سے بڑا فرض ہونا چاہیئے یہ ضرور نہیں ہے کہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم پائیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ سب معمولی لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ حضور پرنور کی رعایا میں کوئی شخص ایسا نہ ہو۔ جو ابتدائی تعلیم سے محروم رہ جائے ہماری نظر میں بہت سی مثالیں ایسے شخصوں کی ہیں جنہوں نے صرف ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن وہ اپنی قابلیت اور قوتِ مطالعہ سے بڑے آدمی ہوگئے۔ ثروت و جاہ ہی میں نہیں، بلکہ علم و فضل میں بھی۔ ابتدائی تعلیم زینہ ہے آئندہ اصلاح کا اور انفرادی اور اجتماعی ترقی کا۔ ابتدائی تعلیم کو زیادہ موثر اور وسیع کرنے اور عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے مجالسِ لوکل بورڈ سے کام لینا چاہیئے ہر مجلس میں غالباً چند ارکان ایسے ہوں گے جنہیں تعلیم سے کچھ نہ کچھ دلچسپی ہوگی اور اگر مجلس کے یہ ارکان مہتمم تعلیمات کے مشورہ سے ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں سعی کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ اس میں بڑی کامیابی ہوگی۔ رہا یہ امر کہ اس کی کیا صورت ہوگی۔ میں اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اس موقع پر مناسب خیال نہیں کرتا۔

ابتدائی تعلیم کی اشاعت سے ایک اور بڑا مقصد میرے مدنظر ہے جو ہر طرح لائق قدر

اور قابل لحاظ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حال میں ہمارے ہاں کوآپریٹو کریڈٹ (قرضہ باہمی) کا طریقہ جاری کیا گیا ہے۔ اسے آپ کوئی معمولی تجویز نہ خیال فرمائیں۔ یہ ایک بڑی چیز ہے اور اس کا اثر اور فائدہ دور تک پہنچنے والا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں آبادی کی تعداد کثیر زراعت پیشہ ہے اور اُن کی خوش حالی پر ملک کی خوش حالی منحصر ہے۔ اور اب تک کوئی تجویز کوآپریٹو کریڈٹ سے بہتر خیال میں نہیں آئی ہے لیکن اس کے فوائد سے مزارعین اُس وقت تک بہرہ مند نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان میں کم سے کم ابتدائی تعلیم نہ ہو۔ اور اس لئے اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ضرور ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ابتدائی تعلیم کی اشاعت کی جائے۔ اس خیال کو آپ مدنظر رکھیں گے تو ابتدائی تعلیم کی وقعت آپ کی نظروں میں اور بڑھ جائے گی۔

حضرات! باوجود اس عام تعلیمی پست حالت کے جس کا ذکر میں نے اب تک کیا ہے یہ بات کچھ کم مسرت اور فخر کی نہیں ہے۔ کہ ہمارے ہاں علوم مشرقیہ کی تعلیم کا انتظام بہت قابل اطمینان طور پر ہو گیا ہے۔ ہمیں دارالعلوم کے لئے ایک ایسے فاضل پرنسپل مل گئے ہیں جو علوم مشرقیہ کے متبحر اور علوم مغربیہ کے عالم ہیں اور جن کے علم و فضل و کمالات اور اعلیٰ اخلاق سے ہمارے ملک کو بیش بہا فائدہ پہنچے گا۔ نصاب تعلیم کی مناسب ترمیم کی گئی ہے اور جو نقص باقی ہیں وہ رفتہ رفتہ سب رفع ہو جائیں گے۔ سائنس کے تعلیم کی ابتدا کی گئی ہے۔ جو چند سال میں مکمل ہو جائے گی۔ اسی کے سلسلہ میں اضلاع میں بعض مقامات پر مدارس فوقانیہ کے قائم کرنے کا بھی ارادہ ہے اور پہلا مدرسۂ فوقانیہ اورنگ آباد میں قائم ہو چکا ہے۔ میں ابھی حال میں اورنگ آباد گیا تھا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ اگرچہ ابتدا ہے۔ لیکن مدرسہ صحیح اصول پر چلایا جا رہا ہے اور اس میں زندگی اور ترقی کے

آثار نمایاں ہیں۔ اور زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ جن حضرات کے ہاتھ میں اس کا انتظام ہے وہ اس کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور اس کام کو بڑے شوق اور جوش سے انجام دے رہے ہیں۔

میرا یہ خیال ہے اور مجھے اس پر کامل وثوق ہے کہ ہماری علمی ترقی کا اگر کوئی صحیح راستہ ہوسکتا ہے تو وہ یہی ہے تقریباً ایک صدی کے تجربہ نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ خالص مغربی تعلیم ہمارے ملک کے لئے مفید نہیں ہوسکتی۔ جس تعلیم میں ملکی ضروریات کا لحاظ نہ ہو۔ اور جس کی بنیاد ملکی اور قومی خصائص پر نہ ہو وہ کوئی تعلیم نہیں اسی طرح خالص مشرقی تعلیم بھی موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے سودمند نہیں ہوسکتی۔ ایک ہمیں ملک و قوم سے بیگانہ کردیتی ہے اور دوسرے ہمیں زمانۂ حال کی ترقی اور روشنی سے محروم رکھتی ہے دونوں الگ الگ ناقص اور ناکمل ہیں۔ اور اس لئے ضرور اور لابدہے کہ دونوں کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور ایسا نصابِ تعلیم تیار کیا جائے جو حقیقی علم و اخلاق کا سرچشمہ ہو لیکن اسے کامیاب بنانے کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ ایک خاص مدت تک علوم اپنی زبان میں سکھائے جائیں۔ غیر زبان کے ذریعہ علم حاصل کرنے میں جو نقصان عظیم ہمیں پہنچا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اب اس سے درگزر کی جائے اور اس کی تلافی اور آئندہ کی اصلاح کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے دماغوں پر بہت بڑا بار اور بہت بُرا اثر پڑتا ہے بلکہ جدتِ طبع اور رسائی ذہن ایک حد تک معطل ہوجاتی ہے یہ امر بہت قابلِ اطمینان ہے کہ سررشتۂ تعلیم اس مسئلہ پر غور کر رہا ہے اور جدید نصابات کی ترتیب میں اسے خاص طور سے ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن اس کے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی زبان کو علمی کتب سے مالا مال کردیں تاکہ علم کی تحصیل میں

ہمارے طالب علموں اور اہل ملک کو دقت نہ رہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو اس بارے میں بہت اچھا کام کر رہی ہے اور امید ہے کہ اس کی سعی سے ہماری زبان کے ذخیرہ علوم وفنون میں بیش بہا اضافہ ہو جائے گا۔

لیکن اس سے کوئی صاحب یہ خیال نہ کریں کہ میں مغربی تعلیم یا انگریزی زبان کی تحصیل کا مخالف ہوں بلکہ میں اس کا بھی ویسا ہی حامی ہوں جیسا مشرقی تعلیم کا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ عام طور پر قطع نظر بعض مستثنیات کے ابتدائی مدارج میں انگریزی کی تعلیم بجائے مفید کے مضر ہوتی ہے البتہ اعلیٰ مدارج میں اس کی تعلیم بطور زبان ضروری اور لازمی ہے اور بغیر اس کے ہم ہرگز صحیح اور حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتے ممکن ہے کہ یہ طریقہ برٹش انڈیا میں مفید نہ ہو کیونکہ وہاں بغیر انگریزی تعلیم کے اعلیٰ ترقی ممکن نہیں اس لئے کہ وہاں کے تمام بڑے دفاتر میں نیز سرکاری خط وکتابت میں انگریزی کی ضرورت ہے لیکن بخلاف اس کے ہماری ریاست کی سرکاری اور دفتری زبان اُردو ہے اور یہاں کے حالات برٹش انڈیا کے حالات سے مختلف ہیں۔

دارالعلوم اور مدرسہ فوقانیہ کا انتظام اسی نہج پر کیا گیا ہے۔ کتب کے متعلق بڑی چھان بین کی جارہی ہے۔ عمدہ مدرس اور علماء کے انتخاب میں بہت غور وفکر کیا جاتا ہے۔ ضروری سامان بھی رفتہ رفتہ مہیا کیا جارہا ہے اور جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے اور خدا نے چاہا تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دُور دُور پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدر آباد مرکز علوم وفنون بن جائے گا۔

اشاعت تعلیم کا ایک بڑا ذریعہ کتب خانے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مدارس کے بعد اس سے

بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں۔ کتب خانوں نے ہمیشہ بڑا کام کیا ہے۔ اور بڑے بڑے لوگ پیدا کئے ہیں۔ ہندوستان کتب خانوں کے لئے قدیم زمانہ سے مشہور ہے۔ ہر پڑھے لکھے شخص کے گھر میں کتابوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اور بعض بزرگوں اور خاندانوں کا ذخیرہ تو نہایت بیش بہا اور قابلِ رشک تھا۔ اور اس زمانے میں تو اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ کتابوں کی آج کل اس قدر کثرت ہوتی جاتی ہے کہ ان کا جمع کرنا کسی ایک شخص کا کام نہیں۔ ایک شخص اپنے مذاق کی کتابیں جمع کرسکتا ہے۔ لیکن ہر فن و علم کی کتب کا جمع کرنا شخصی قدرت سے باہر ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ سرکار کی طرف سے یا باہمی کوشش سے جگہ جگہ کتب خانے قائم کئے جائیں۔ تاکہ طالب علم اطمینان خاطر سے اپنی فرصت کے وقت میں کتب کا مطالعہ کرسکیں۔ اور جنہیں خدا نے علمی ذوق اور ذہن رسا عطا فرمایا ہے وہ جدید تحقیقات کا ڈول ڈالیں اور اپنے اور اپنے ملک کے علم میں اضافہ کریں اور جو لوگ اپنے کام دھندوں میں مصروف ہیں۔ انہیں بھی موقع ملے گا۔ اور ترغیب ہوگی کہ اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد مطالعہ کتب سے سچی خوشی اور فیض حاصل کریں۔ ایک اچھا کتب خانہ ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ اشاعتِ علم میں کتب خانہ، مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ بہت سے لوگ جنہوں نے صرف ابتدائی تعلیم پائی تھی کتب خانوں کی بدولت بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ اور انہوں نے بڑی بڑی علمی خدمتیں کی ہیں ہمارے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بلدہ میں بہت اچھا کتب خانہ موجود ہے۔ اور ہر سال اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے اور امید ہے کہ ایک مدت کے بعد اس کا ہندوستان کے نامی کتب خانوں میں شمار ہوگا۔ لیکن ضرورت ہے کہ اضلاع میں بھی مختلف مقامات پر کتب خانے قائم کئے جائیں جس میں خاص کر اردو اور دیگر ملکی زبانوں کی کتب کا اچھا ذخیرہ ہو۔ کیونکہ صرف

خواندہ ہونا ہی کافی نہیں بلکہ علمی ذوق بھی پیدا ہونا چاہیئے ۔ اور یہ ذوق بہ نسبت مدارس کے کتب خانوں کے ذریعہ سے بہت اچھی طرح پیدا ہو سکتا ہے ۔ اور اس لئے میری رائے ہے کہ نہ صرف بڑے بڑے مقامات میں بلکہ ہر پرائمری مدرسہ میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہو جس میں ایسی کتابیں مہیا کی جائیں جو نہ صرف بچوں کے لئے مفید ہوں بلکہ گاؤں کے اور لوگ بھی دلچسپی سے پڑھ سکیں اور اہلِ دیہات کو ان کتب خانوں سے کتابیں دے کر ان میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے تاکہ مدارس میں اور گاؤں والوں میں خاص تعلقات پیدا ہو جائیں جو مدارس اور اہلِ دیہات دونوں کے لئے مفید ہوگا ۔ اور اسی طرح سے رفتہ رفتہ سفری کتب خانوں کا رواج دیا جائے اور پڑھنے لکھنے اور مطالعہ کا عام شوق تمام ملک میں پیدا کیا جائے ۔

حضرات ! سرکار عالی تعلیمی پستی کی طرف سے غافل نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ سے اس کی اصلاح کے متعلق خاص انتظام کیا جا رہا ہے چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال پہلے ایک ماہرِ فن بیش قرار تنخواہ پر اسی غرض سے طلب کیا گیا تھا ۔ جس نے دو سال میں تقریباً تمام ملک کا دَورہ کر کے بڑی محنت اور غور و فکر سے ایک رپورٹ مرتب کی اس کے بعد سے مختلف تجاویز عمل میں آئی ہیں ، متعدد اسکیمیں منظوری کے لئے پیش ہیں اور سر رشتۂ تعلیمات ہر قسم کی تعلیم کی اصلاح و ترقی میں سرگرم ہے مثلاً مختلف نصابات کی ترمیم و ترتیب ، دیسی زبانوں اور اُردو کی تعلیم کا صحیح انتظام مدارس کی تعداد میں اضافہ ، عمدہ مدرسین کا انتخاب ، مدارس صنعت و حرفت کی اصلاح ، صیغۂ نظارت و نگرانی کی تنظیم وغیرہ یہ ایسے مسائل ہیں جو سرکار کے زیرِ نظر اور زیرِ عمل ہیں خصوصاً کتب نصاب تعلیم کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ ابتدائی تعلیم کی کتابوں میں مقامی خصوصیات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے درسی کتب سے صرف

دماغی ترقی ہی کا کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ اُن کے ذریعہ سے حب وطن، اتفاق، وفاداری اور خلوص و ایثار کے جذبات بھی دلوں میں پیدا کرنا چاہیئیں۔ اور اس لئے میری رائے ہے کہ ہمیں اپنے مدارس کے لئے جدید کتابیں تالیف کرانی چاہیئیں جن میں ان باتوں کا خیال رکھا جائے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک سرکار کا تعلق ہے، تعلیمی ترقی و اصلاح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جائے گا، خصوصًا ایسے زمانے میں جب کہ خود اعلیحضرت اقدس خلد اللہ ملکہٗ تعلیم کے بڑے حامی اور سرپرست ہیں، یہ ممکن نہیں کہ اس بارے میں کسی قسم کی کوتاہی اور تساہل ہو سکے۔ لیکن جب تک ملک کے روشن خیال اور تعلیم یافتہ اصحاب سرکار کے ہاتھ نہ بٹائیں گے اس میں کامل کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بے علمی کے معنی اب صرف جہالت ہی نہیں بلکہ اس میں افلاس، رذالت، اور زوال کے معنے بھی پنہاں ہیں اور اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ سچے جوش اور خلوص کے ساتھ اس کام کو کریں اور مشنریوں کی طرح ملک میں جگہ جگہ تعلیم کی اشاعت کے درپے رہیں۔ اور جو لوگ اس مقدس کام میں مصروف ہیں ان کی عزت و توقیر کریں تب کہیں جا کے اُس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے جو ہمارے ملک کو پہنچا ہے۔ خدا کے فضل سے اس ریاست کو ہر قسم کی آسانیاں حاصل ہیں۔ ملک کا رقبہ، اس کے ذرائع آمدنی، اس کی آبادی اس کی پیداوار، اس کے قدرتی مناظر، اس کی تاریخی وقعت یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے لئے حوصلہ افزا ہیں، اور سب سے بڑھ کر جو ہمیں تفوق ہندوستان کے دوسرے حصوں پر حاصل ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ہندو مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اُن کی ضروریات اور خواہشات سب ایک ہیں اور اُن کے تعلقات باہمی ایسے ہیں کہ ہندو مسلمان کا امتیاز جو دوسرے مقامات میں

پایا جاتا ہے۔ یہاں خیال میں بھی نہیں آتا۔ یہ اس ریاست کے اعلیٰ خصوصیات میں سے ہے اور آج سے نہیں بلکہ صدہا سال سے ہے اور خدا نے چاہا تو یہ خصوصیت ہمیشہ قائم رہے گی اور ہندوستان کے دوسرے صوبے اس سے ایک بے بہا سبق حاصل کریں گے لیکن زمانہ حال میں ایک اور جدید عنصر ایسا پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے ہمارے سابقہ تعلقات کو اور مستحکم کر دیا ہے وہ عنصر اُردو زبان ہے اس سے قبل یہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی لیکن پھر وہ غیر زبان تھی۔ اس کی جگہ اب اُردو نے لے لی ہے جو ایک ہندی اور آریائی زبان ہے اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کی متفقہ کوشش سے پیدا ہوئی ہے اور اُسے قدیم پراکرت سے وہی تعلق ہے جو ہندوستان کی دوسری آریائی زبانوں کو ہے۔ جو شخص مرہٹی، گجراتی وغیرہ زبانیں جانتا ہے وہ جب ان زبانوں پر اصول لسان کے لحاظ سے نظر ڈالے گا تو فوراً یہ کہے گا کہ یہ بہنیں بہنیں ہیں۔ ہندوستان کو جانے دیجئے اسی ایک ریاست کو لیجئے جس میں کئی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں جب دو فرقوں یا مختلف مقامات کے لوگ جو ایک دوسرے کی زبان سے نا واقف ہیں، باہم گفتگو کرنا چاہیں گے، تو ان کا ذریعۂ اظہار خیالات اُردو ہو گا جو ہر شخص بول سکتا یا سمجھ سکتا ہے گویا اردو ہم سب میں ایک زبان مشترک ہے جو ہمیں ہم خیال اور متفق بنانے میں بہت بڑی معاون ہے۔ میرا اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ مقامی زبانوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ سررشتہ تعلیمات نے جو جدید نصاب مرتب کئے ہیں، اس میں ان کی اہمیت کا پورا لحاظ کیا ہے اور ابتدائی تعلیم مقامی یعنے وہاں کی مادری زبان میں لازمی قرار دی ہے۔ لیکن آگے چل کر یعنے اوپر کی جماعتوں میں اُردو کی تحصیل بھی ضروری قرار دی کیوں کہ یہ اس ریاست کی سرکاری زبان ہے اور مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ قصبات اور دیہات میں لوگ اُردو تعلیم

کے بہت شائق ہیں اور مدارس میں اردو مددگاروں کے تقرر کے لئے ہمیشہ درخواستیں پیش کرتے ہیں اور علاوہ اس کے اس سے ہمارے اتفاق و اتحاد کے برقرار رکھنے اور ترقی دینے میں مدد ملے گی اردو کی ابتدا بھی مختلف اقوام اور مختلف مذاہب والوں کو ہم زبان و ہم خیال بنانے کے لئے ہوئی تھی، اور اب بھی وہ یہی کام کر رہی ہے اور اگر ہم نے دور اندیشی سے کام کیا تو آئندہ اس سے زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

لیکن ہماری توجہ صرف ذہنی تعلیم ہی تک محدود نہ رہنی چاہیئے، ہمیں ان فنون کی طرف بھی خیال کرنا ضروری ہے جنہیں ہماری، معاشرت اور اقتصادی حالت میں بہت کچھ دخل ہے۔ ملک کی ضرورتیں مختلف اور متعدد ہوتی ہیں۔ اور اس لئے اس میں مختلف قسم کے اہل علم و اہلِ فن ہونے چاہئیں۔ اسے جیسے علماء کی ضرورت ہے ویسے ہی تاجروں اور دستکاروں کی بھی حاجت ہے۔ ہندوستان قدیم سے اپنی صنعت اور دستکاری کے لئے مشہور چلا آرہا ہے اور یہ شہرت کوئی معمولی نہ تھی بلکہ ہندی دست کاری اور صنعت ایسی عجیب و غریب تھی کہ اُس وقت تو کیا اب بھی غیر ملک والے اس کا مقابلہ تو کہاں پوری نقل بھی نہیں کر سکتے۔ اس ریاست ہی کو لیجئے آپ اضلاع میں جائیے۔ ہر جگہ آپ کو قدیم صنعت و دست کاری کے یادگاریں ملیں گی، جو ہماری بے توجہی اور ناقدری سے بڑی سسک رہی ہیں۔ میں اون تمام اسباب پر بحث کرنا نہیں چاہتا جو ہماری قدیم صنعتوں کی تنزل کا باعث ہوئیں۔ لیکن منجملہ دیگر اسباب کے دو بڑے سبب معلوم ہوتے ہیں، ایک مشین جس نے کاریگر ہاتھوں کو بے کار کر دیا اور دوسرے ہماری بد مذاقی اور سچ یہ ہے کہ ان مشینوں نے ہماری صنعتوں پر وہ ظلم نہیں ڈھایا جو ہماری بد مذاقی سے اُن پر ہوا ہے۔ اورنگ آباد کا ہمرو، جامہ وار اور مشروع،

ورنگل کے قالین، پٹن کی ساڑیاں اور بگڑیاں اور بیدر کا نفیس کام، سدی پیٹھ کے ریشمی کپڑے، نرمل کی لکڑی پر نقاشی، کنول کے کھلونے وغیرہ وغیرہ بیسیوں قسم کی ایسی چیزیں ہیں جو درحقیقت قابل قدر ہیں اور اگر اہلِ ملک انکی قدر کریں تو ان میں از سرِ نو جان پڑجائے گی، ۱۸۵۱ء میں ایک بڑی بھاری نمایش لندن میں ہوئی تھی اس میں ایک صیغہ قالینوں کا تھا۔ جہاں ملک ملک سے قالین آئے تھے۔ آج آپ یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ سب سے بہتر قالین ورنگل کا قرار دیا گیا تھا۔ آج دُنیا میں قالینوں کی نمایش کی جائے تو کیا آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ ورنگل کے قالین کو وہی عزت حاصل ہوگی؟ یہ سب ہماری بدمذاقی کے کُشتہ ہیں۔ ہمارے فنون لطیفہ میں سے قدیم فن مصوری اور فن تعمیر کو لیجئے جن کی تمام عالم قدر کررہا ہے۔ اور جن کی دیکھا دیکھی شاید ہم بھی قدر کرنے لگے ہیں میں ابھی حال میں ایلورا اور اجنٹہ دیکھ کر آیا ہوں۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ اور یہ جو عوام کہتے ہیں کہ ان کے بنانے والے دیوتا یا جنات تھے۔ میرے خیال میں سچ کہتے ہیں۔ کیوں کہ جب ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔ اور اُن قدیم بانیوں کا خیال کرتے ہیں تو کسی طرح یہ قیاس میں نہیں آتا کہ وہ بھی اسی ملک کے رہنے والے تھے۔ جس میں ہم رہتے ہیں۔ لیکن انسان کے انتہائی کمال کے یہ دو نمونے صرف دیکھنے اور دیکھکر حیرت اور تعریف ہی کے قابل نہیں بلکہ یہ زندہ مدرسے ہیں جو صدہا سال سے دنیا کی تعلیم کے لئے خاموش کھڑے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ان زندہ جاوید معلموں سے ہم کچھ حاصل کریں اور اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اورنگ آباد میں ایک آرٹ اسکول (مدرسہ فن مصوری) صحیح معنوں میں قائم کیا جائے اور اس مدرسہ کے اعلیٰ مدارج کے

ہونہار اور ذہین طالب علم اپنی عمر کا حصہ وہیں گزاریں۔ اور اس کمال کی تحصیل کریں جو کسی زندہ مصور سے دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ سارے عالم میں اس سے بڑھ کر اس فن کی کوئی اعلیٰ درسگاہ نہیں ہے اور یہ تنہا میرے ہی رائے نہیں ہے بلکہ یورپ کے بڑے بڑے مبصرین اور ماہرین کا بھی یہی خیال ہے اسی طرح دہلی و آگرہ جائیے تاج محل، موتی مسجد، جامع مسجد دہلی، قلعہ اور دیگر عمارات کے دیکھنے سے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اس سے نہ صرف ہمیں اپنی بزرگوں کی عظمت و کمال کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ نہ صرف اس سے سبق و عبرت حاصل ہوتی ہے اور نہ صرف دلوں میں غیرت و ترقی کی ترغیب پیدا ہوتی ہے بلکہ ہمارے اخلاق اور ذوق پر بھی اثر پڑتا ہے اور صحیح ذوق یا احساس حسن تعلیم کا بڑا جزو ہے۔ جو زندگی کے ہر شعبہ اور کام میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

علاوہ حرفت و صنعت کی تعلیم کے تجارتی تعلیم بھی ایسی ہی ضروری ہے۔ اور ملک کی خوش حالی اور ترقی کا بہت کچھ دارومدار ان پر ہے۔ حرفت و صنعت کی صحیح اصول پر سکھانے کے لئے سرکار کی طرف سے کوشش کی جارہی ہے اور وہ وقت بھی آئے گا جب کہ یہاں تجارتی تعلیم کے لئے تجاویز عمل میں آئیں گی۔

میں اب آخر میں آپ کی خدمت میں دو تین باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل یہ کہ اگر ہم صاحب جاہ و مال اور صاحبِ حکومت کی عزت کرتے ہیں۔ تو اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر ہمیں صاحب علم کی بھی عزت کرنی چاہئے۔ جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں اور علم کی اشاعت کرتے ہیں۔ وہ ہماری عزت کے بدرجہا زیادہ مستحق ہیں بہ نسبت اُن لوگوں کے جو مال و دولت کے جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک مدرس خواہ وہ کتنی ہی کم تنخواہ کا

کیوں نہ ہو قابلِ وقعت ہے۔ اس لئے کہ وہ ملک کی بڑی خدمت کر رہا ہے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کا محسن ہے۔ ہمارا ملک استاد کی عزّت کرنے میں ضرب المثل ہے اور ہمارے ہاں اُستاد کی عزّت باپ سے زیادہ کی جاتی تھی۔ اور بلاشبہ وہ اس کا مستحق ہے۔ دوسرے کم استطاعت اور ہونہار طلباء کی مدد کرنا ہمارا بڑا فرض ہے۔ ان ہی کنکروں میں جواہر بھی ہوتے ہیں۔ اور کیا معلوم کہ ان ہی میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہمارے ملک کے لئے باعثِ فخر ہوں۔ ایسے لڑکوں کی مدد کرنا اپنے ملک کی مدد کرنا ہے۔ تیسری بات جو میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیشہ عام باتوں اور عام مسائل پر گفتگو کرتے رہنا کچھ بہت زیادہ مفید نہیں ہے، ہمیں اس سے آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔ اور جس خاص فن یا شاخ کو ہم اختیار کریں اس میں ہم منہمک ہو جائیں اور ساری عمر اُسی میں صرف کر دیں۔ اور اس لئے ہمارے ملک میں کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں۔ جو واقعات پر غائر نظر ڈالیں۔ ہر ایک واقعہ کی پوری چھان بین کریں۔ اُسے جانچیں اور تولیں اور کرید کرید کر جزئیات اور تفصیل پر قدرت حاصل کریں تاکہ وہ اپنے اپنے شعبہ اور فن میں ماہر اور باکمال ہوں اور اس وقت ان کے کمال سے خود بخود تمام ملک میں ایسی روشنی پھیلے گی۔ جس کا اندازہ ہم اس وقت نہیں کر سکتے۔ کام بہت ہیں لیکن مزدور کم ہیں اور ان ہی معزز مزدوروں کی محنت اور مشقت پر ہماری خوشی ہماری کامیابی اور ہماری فلاح کا انحصار ہے۔

چوتھی درخواست میری یہ ہے کہ جہاں ہم اپنی ذات کے لئے اتنا کچھ کرتے ہیں۔ وہاں ہم تھوڑا سا کچھ اپنے ملک کے لئے بھی کریں۔ ہم دُنیا میں تنہا نہیں ہیں

اور نہ ہو سکتے ہیں ہماری ساری حالیتں اور ساری امیدیں اپنے ملک سے وابستہ ہیں۔ ملک کی فلاح میں ہماری فلاح اور ملک کے نقصان میں ہمارا نقصان ہے۔ اس لئے ہمیں کچھ ایثار سے بھی کام لینا چاہیئے۔ اگر ہم میں اپنے ملک کی کچھ محبت ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اُن خوفناک آفتوں سے بچنے کے لئے جو جہالت سے پیدا ہوتی ہیں خلوص و ایثار جوش و صداقت سے کام لیں جہالت کا مقابلہ کریں اور علم کا نور تمام ملک میں پھیلائیں۔ ایثار و خلوص وہ خوبیاں ہیں کہ جس قوم و ملک میں پیدا ہوگئیں۔ انہیں کوئی قوت ترقی سے نہیں روک سکتی۔

حضرات! وقت کم ہے اور کام بہت، رستہ کٹھن ہے اور منزل مقصود دور اس لئے آؤ اب ایک زبان و یک دل ہوکر اس مقدس کام کو شروع کریں۔ جس پر ہمارے ملک کی ترقی و اصلاح کا دارومدار ہے اور خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے ارادوں اور ہمتوں میں برکت دے اور ہم سب کو نیک توفیق عطا کرے۔ اور ہمارے آقائے ولی نعمت حضور پُرنور بندگان عالی متعالی خلد اللہ ملکہ کی صحت و اقبال و عمر میں ترقی عطا فرمائے۔ کیوں کہ اُن کی کامیابی میں ہماری کامیابی اور اُن کی عظمت و اقبال میں ہماری عزت و مسرت ہے۔ آمین۔

خطبۂ صدارت

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ مدراس

منعقدہ وانیم واڈی

۲۸؍ اکٹوبر ۱۹۱۶ء

حضرات! جس طرح بعض اوقات افراد پر مصیبت پڑتی ہے، بعض قوموں پر ادبار چھا جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی ساری دنیا پر بلا نازل ہوتی ہے جس میں تمام بنی نوع انسان کو معصوم ہوں یا خاطی۔ امیر ہوں یا غریب، چھوٹے ہوں یا بڑے، یہاں تک کہ بے زبان مخلوق کو بھی مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ آج کل ایک ایسی ہی بلائے عظیم اس عالم پر مسلط ہے۔ دو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ ایک ہولناک جنگ یورپ میں چھڑی ہوئی ہے جس کے کشت و خون قتل و غارت ظلم و سفاکی اور اقتصادی و اخلاقی غارت گری کی نظیر تاریخ میں نظر نہیں آتی اور جس کے تباہ کن نتائج دنیا کے گوشہ گوشہ میں نمایاں ہیں۔ ہر جگہ اسی کا چرچا ہے۔ ہر قسم کے کاروبار و معاملات میں خلل پڑ گیا ہے۔ ایسے پُر آشوب زمانہ میں یہ تعلیمی منصوبوں کا عمل میں لانا سخت دشوار ہے۔ لیکن اگرچہ سرمایہ کی قلت ہماری سدِ راہ ہو اور دیگر وسائل و ابوابِ ترقی ہم پر بند ہوں، مگر ہمارا دماغ اور تخیل ایک حد تک آزاد ہے۔ ہم ان مسائلِ علمی پر باطمینانِ کامل غور کر سکتے ہیں جن کے لئے وقت درکار ہے ہم اُن تجاویز کے انتظامات اور تخمینوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جن کی آگے چل کر ہمیں ضرورت پڑے گی! اور ہم اُن تمام امور پر آزادی دُور بینی کے ساتھ نظر ڈال سکتے ہیں جن پر ہماری ترقیوں کا دارومدار ہے۔ تاکہ جب یہ منحوس زمانہ ٹل جائے اور بڑے بول کا سر نیچا اور سچ کا بول بالا ہو اور متحدین اس نصب العین تک پہنچ جائیں جس کے لئے وہ ہر قسم کی قربانی کر رہے ہیں اور امن و انصاف پسند برطانیہ اس طوفان خیز تلاطم سے سرخرو ہو کر نکلے تو ہم احتیاط، آسانی اور خوبی اور عجلت کے ساتھ ان تمام منصوبوں کو عمل میں لا سکیں اور ایک حد تک اس دورِ انتشار کی تلافی کر سکیں۔

اس لیے اس کانفرنس کا یہ اجلاس گویا ایک قسم کی تیاری ہے آئندہ اصلاحات کی یہ تحریک ہے ان مباحث کی جن پر غور کرنا ہمارے تعلیمی بہبودی کے لئے ازبس ضروری ہے یہ سعی ہے اُس نصب العین تک پہنچنے کی جس کے بغیر ہماری تعلیمی کوششیں نامکمل رہیں گی۔ میں نہیں جانتا کہ میں کن الفاظ میں اُس قابل فخر عزت کا جو آپ نے مجھے اس مجلس کی صدارت سے بخشی ہے۔ شکریہ ادا کروں۔ میرا استحقاق (اگر کوئی ہو سکتا ہے) تو صرف اتنا ہے کہ میں اپنی ملازمت کے دوران میں سولہ برس قبل یہاں دس ماہ تک مقیم رہا۔ اگرچہ یہ بہت قلیل مدت تھی، مگر میں اس زمانہ کو کبھی نہیں بھول سکتا اور اُس کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ اور اُن صاحبوں میں سے جن کی دوستی کی عزت مجھے حاصل ہوئی سب سے مقدم نام مسٹر محمد ابراہیم قریشی کا ہے۔ جو اُن چند بےنفس اور مخلص کام کرنے والوں میں سے ہیں جن کی مساعی جمیلہ سے وانیم واڈی قریب زمانے میں جنوبی ہند کا علی گڈھ ہونیوالا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ مجھ میں اس خدمت کے انجام دینے کی کہاں تک صلاحیت واہلیت ہے جو آپ نے بکمال عنایت و عطوفت میرے سپرد کی ہے اس کی نسبت میں قبل از قبل عرض کئے دیتا ہوں کہ میں ایک عرصہ سے ایک دیسی ریاست میں ملازم ہوں جو اپنی وسعت ورقبہ میں احاطۂ مدراس سے کچھ ہی کم ہے اور جہاں کے حالات برٹش انڈیا سے بہت کچھ مختلف ہیں اور اپنی حیثیت کی وجہ سے خاص نوعیت رکھتے ہیں۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ اس دوری کی وجہ سے برٹش انڈیا کے بعض اہم اور خاص معاملات سے پہلا سا گہرا اور ذاتی تعلق نہیں رہا اور علاوہ اس کے میں آپ کے صوبہ سے بھی ایک مدت تک دور رہا ہوں۔ اور اس لئے ممکن ہے کہ میں ایسے امور میں جن کا تعلق انسانی جذبات اور محسوسات سے ہے آپ کے خیالات کی تہ تک نہ پہنچوں یا اُن حالات کی عدم واقفیت

کی وجہ سے جو اس زمانے میں آپ کے گردوپیش پیدا ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض بعض باتوں میں مجھ میں اور آپ میں توافق نہ ہو۔ اس لئے آپ میرے خیالات کو ایسے مستند اور قطعی خیال نہ فرمائیں جو صرف سرداران ملت کا حق ہے۔ بلکہ آپ انہیں محض رائیں اور مشورے تصور فرمائیں جو اس خالص ہمدردی کی وجہ سے میرے دل سے نکلے ہیں جو مجھے آپ کی بے ریا اور سچی کوششوں سے ہے۔ ممکن ہے کہ میرے یہ ناچیز مشورے آپ کو ان اہم مسائل میں کچھ مدد دیں۔ جن کے حل کرنے میں آپ مصروف ہیں۔ اور اس سے زیادہ مجھے کسی چیز کا دعویٰ نہیں ہے۔

ابتدائی تعلیم

حضرات! ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ ہمیں تعلیم کی ضرورت و اہمیت کے متعلق تقریروں کی نہیں بلکہ وعظوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ زمانہ جاتا رہا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے جس میں ہماری کوششیں صحیح راستہ پر آ رہی ہیں۔ مجھے اس بارے میں کسی تلقین اور نصیحت کی ضرورت نہیں لیکن اس بات کی ضرورت ہے اور سخت ضرورت ہے کہ جس طرح ایک ساہوکار دیوالی کے روز اپنے کاروبار اور آمد و خرچ کا حساب لگاتا ہے ہم بھی سال میں ایک بار اپنی کوششوں اور محنتوں کا حساب لگائیں اور دیکھیں کہ گزشتہ سال کے مقابلہ میں ہم نے کیا ترقی کی۔ ہماری کوششوں اور محنتوں کا کیا نتیجہ نکلا، ہمارا تعلیمی کاروان کس منزل پر ہے اور آئندہ ہمارا پروگرام کیا ہوگا لہٰذا اگر میں جنوبی ہند کے مسلمانوں کے متعلق چند واقعات کا اظہار کروں تو امید ہے کہ آپ اسے صبر و اطمینان سے سماعت فرمائیں گے ہندوستان کے تمام صوبوں میں باشثنائے ممالک متوسط مدراس میں

مسلمانوں کی سب سے زیادہ کم آبادی ہے یعنی دس ہزار میں صرف ۶۲ ۹ البتہ جب خواندہ آبادی کا شمار کیا جاتا ہے تو مدراس کے خواندہ مسلمانوں کا تناسب دوسرے صوبوں کے مسلمانوں بلکہ ہندوؤں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ گزشتہ مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدراس کے مسلمانوں میں ہزار میں ۱۶۶ مرد اور ۱۱ عورتیں خواندہ ہیں حالانکہ یہاں ہندوؤں میں ۱۳۵ مرد اور ۱۱ عورتیں مسلمانان بمبئی میں ۸۵ مرد، عورتیں بنگال میں ۲۷، مرد اور ۲ عورتیں، صوبجات متحدہ میں ۸۵ مرد ۶ عورتیں، پنجاب میں ۲۷ مرد اور ۲ عورتیں ہیں۔ حیدرآباد میں ۱۰۳ مرد اور ۱۳ عورتیں خواندہ ہیں۔ گزشتہ پنج سالہ تعلیمی رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدراسی مسلمان طلبہ کا تناسب دیگر تمام اقوام کے طلبا کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ حالانکہ پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۵۰ فی صدی ہے مسلمان زیر تعلیم عمر کے بچے بمقابلہ جملہ اطفال قابل تعلیم کے صرف ۲۹ فیصدی ہیں بمبئی میں جہاں مسلمان ۱۸ فی صدی ہیں مسلمان اطفال زیر تعلیم ۱۶،۶ فی صدی ہیں۔ ۱۲-۱۹۱۱ء میں مدراس میں قابل تعلیم عمر کے اطفال میں ۹ فی صدی مسلمان بچے تھے حالانکہ ہماری آبادی صرف ۶،۶ فی صدی ہے۔ یہ واقعات بلاشبہ موجب مسرت ہیں۔ اور اس سے جنوبی ہند کے مسلمانوں کی مستعدی اور علمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں ان اعداد و شمار پر پھولنا نہیں چاہیئے کیونکہ تمام ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی حالت اس لئے خوش آیند ہے کہ ان اعداد و شمار میں ان بچوں کا بھی شمار کیا گیا ہے۔ جو ان مکتبوں میں پڑھتے ہیں جہاں صرف قرآن پڑھایا جاتا ہے اور جو جہالت کے رفع کرنے میں بالکل کارآمد نہیں ہیں اگرچہ گذشتہ مردم شماری کے معیار کے لحاظ سے مدراس میں مسلمان خواندہ اشخاص کی تعداد دوسرے صوبوں کے مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کے مقابلہ میں

بھی بہت قابل اطمینان ہے مگر پھر بھی ہندوؤں کی ترقی یافتہ ذات یعنی برہمنوں سے
بہت کم ہے یہ مکاتب ہمارے پاس بطور خام مسالے کے ہیں اور اگر ہم حقیقت میں
اپنی قوم کے لئے کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو نہایت ضروری ہے کہ ان میں ضروری
اصلاح کی جائے اور میری رائے میں اس اصلاح کا عمل میں لانا کوئی زیادہ مشکل کام
نہیں ہے۔ صرف یہ کرنا ہوگا کہ ان ہی مکتبوں میں اُردو نوشت وخواند اور حساب کی تعلیم
اور اضافہ کردی جائے۔ اگر آپ کی کانفرنس اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور
مساجد کے مکاتب اور اسی قسم کے دوسرے مدرسوں میں اس تعلیم کی ابتداء کردے
تو ملک پر بڑا احسان ہوگا۔ پھر یہ آسانی سے ممکن ہوگا کہ یہی لڑکے بڑے مدارس میں
شریک ہوکر تعلیم جاری رکھ سکیں گے اور اگر یہ نہ بھی ہو تو یہ کیا کم ہے کہ انہیں لکھنے پڑھنے
کا ذوق پیدا ہوجائے گا اور ان میں سے اکثر اپنا مطالعہ جاری رکھ کر اپنے ملک
قوم اور اپنی گورنمنٹ کے مفید ثابت ہوں گے۔ سرکار نظام نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ
ان مکاتب کو نیا ضابطہ امداد دے کر دینی تعلیم کے ساتھ دنیوی تعلیم کو رائج کرے۔
اور جہاں تک ممکن ہو انہیں کارآمد بنائے اور جہالت کے زور کو توڑے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے کسی صوبہ میں خواندہ اشخاص کی تعداد اس قدر
نہیں ہے جتنی کہ برہما میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں بُدھ خانقاہوں میں ابتدائی تعلیم
عام طور سے دی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم قومی ترقی کا جزو اعظم ہے۔ اور جب تک
ہم اسے ایک زندہ چیز نہ بنائیں گے جو نشوونما پاسکے، بڑھ سکے اور بارآور ہوسکے
اُس وقت تک اعلیٰ تعلیم اور روشن خیالی کی توقع عبث ہے۔ ابتدائی تعلیم کو باکار اور مفید
بنانے کے ساتھ ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں اسلامی مکتب جو

غفلت و تاریکی میں پڑے ہیں، انہیں روشنی میں لایا جائے۔ اور ضروری اصلاح کے ساتھ انہیں ایک تعلیمی قوت بنایا جائے۔ جس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ ہماری نظام تعلیم میں ایک مضبوط کڑی کا کام دیں گے بلکہ ہزاروں اور لاکھوں مسلمان بچے جو ہر سال جہالت کا شکار ہوتے ہیں علم کی نعمت سے (خواہ وہ کیسی ہی قلیل کیوں نہو) بہرہ ور ہوسکیں گے۔ اگر آپ کی کانفرنس اس حصۂ ملک میں اس کام کو شروع کردے اور ہر ضلع میں اس اصلاح کو عمل میں لانے کے لئے کمیٹیاں قائم کرے۔ جن کا یہی کام ہو کہ وہ ان مکاتب کو مفید ابتدائی تعلیم کے مدرسے بناویں۔ تو یہ ایک ایسا کام ہوگا کہ اس پر جس قدر محنت کی جائے اور صرف کیا جائے کم ہے۔ کیوں کہ یہ بنیادی اور اصولی اصلاح ہوگی۔ اور اغلب ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصص کے مسلمان بھی اس کی تقلید کریں مجھے اُمید ہے کہ آپ کی کانفرنس کی انتظامی مجلس ضرور اس امر پر غور کرے گی۔ اور جہاں تک جلد ممکن ہوگا اس قسم کی کمیٹیاں مختلف مقام میں قائم کردے گی۔

ہم نے بہت وقت کھویا ہے۔ ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں اس لئے اب زیادہ دیر کرنا ہمارے حق میں سم قاتل ہوگا۔

ثانوی تعلیم

ابتدائی تعلیم کے بعد جب ہم مسلمانوں کی ثانوی تعلیم پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھکر رنج و افسوس ہوتا ہے کہ تعلیم کی اس منزل میں مسلمان بہت پیچھے رہ گئے ہیں سرکاری تعلیمی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ۔

تعداد طلبہ بہ مدارس ثانویہ (بابتہ ۱۹۱۵عیسوی) ۱۹۱٬۶۷ تھی۔

تعداد طلبہ مدارس ثانویہ اور (۱۹۱۴ عیسوی) میں ۶۵۴۳

امتحان کے نتائج حسب ذیل ہیں۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں ۱۶۰ مسلمان طلبہ کو اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ دئے گئے اور امتحان میٹرکولیشن میں ۳ میں سے صرف ۲ کامیاب ہوئے۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں ۱۷۰ کو اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ دئے گئے اور امتحان میٹرکولیشن میں ۲ میں سے ایک کامیاب ہوا۔

مسلمانوں کی تعداد پرائمری تعلیم میں بمقابلہ اون کی مردم شماری ۳،۴ اور ہندوؤں کی ۲،۸ لیکن اگر اس تعداد کا جو مدارس ثانویہ میں پڑھتے ہیں اس تعداد سے مقابلہ کیا جائے جو مدارس ابتدائی میں ہیں تو مسلمانوں کی تعداد ۵،۵ ہوتی ہے اور ہندوؤں کی تعداد ۱۰،۳ گویا ثانوی تعلیم کی فیصدی سے بالکل برعکس ہے۔ لیکن برہمنوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے یعنی ۵۵،۲ فی صدی۔ کامیاب طلبہ کی تعداد نہایت کم ہے۔ اس کمی کے متعلق مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ مدارس میں مسلمان طلبہ کو خاص خاص مشکلات ہیں اوّل تو یہ کہ سرکار اپنے آپ کو صرف ابتدائی تعلیم کی ذمہ دار خیال کرتی ہے۔ تعلیم ثانوی کو وہ زیادہ تر افراد، یا جماعتوں کی فیاضی اور ہمدردی ملکی یا قومی جوش یا عیسائی مشنریوں کی سعی پر چھوڑ دیتی ہے یا ایک حد تک میونسپل یا لوکل بورڈ کی مالی امداد پر۔ مسلمان چونکہ مفلس ہیں۔ اس لئے وہ اپنے مدارس جدید قائم نہیں کر سکتے یا اگر کرتے بھی ہیں تو سرمایہ کے کافی نہونے کی وجہ سے مفت تعلیم نہیں دے سکتے اور مسلمان طالب علم فیس ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ حالانکہ دوسری اقوام اپنے خانگی مدارس قائم کرتے اور فیس وصول کرتے ہیں۔ جس سے انہیں ایک حد تک مالی امداد ملتی ہے۔ ان خانگی مدارس میں مسلمان

طالب علموں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ یا تو بانیٔ مدرسہ کی وصیت یا خواہش کی وجہ سے یا دیگر قواعد یا حالات کی بنا پر وہ اس قسم کے مدرسوں میں داخلہ سے محروم ہو جاتے ہیں ایک اور مشکل مسلمان طالب علموں کو اپنی زبان کی ہے۔ وہ یہ کہ ان مدارس میں اُردو زبان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ خواہ وہ مدراس میونسپل بورڈ کے ہوں یا سرکار کے مسلمان کسی صوبہ کے ہوں اردو کو اپنی قومی زبان سمجھنے لگے ہیں۔ اور اس زبان کی تحصیل کو اپنا فرض سمجھتے ہیں کیوں کہ علاوہ اتحاد قومی کے وہ اُن کے لئے تہذیب ذوق اور حصولِ علم دینی و دنیوی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور اس کی تعلیم کا انتظام نہ ہونا درحقیقت مسلمان طلبہ کے لئے ایک بڑی سدّراہ ہے۔ سررشتۂ تعلیم احاطۂ مدراس نے بھی اس دقت کو محسوس کیا ہے اور سر اسٹے بورن کہتے ہیں کہ ایسے ثانوی مدارس جن میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو نہایت کم ہیں۔ اور نیچے کی جماعتوں میں جہاں ذریعۂ تعلیم دراوڑی زبان ہے۔ مسلمان بڑے خسارے میں ہیں۔ ان سب سے بڑی مشکل ایک اور ہے کہ مسلمانوں کو اب تک دنیوی اعلیٰ تعلیم کی طرف سے بے اعتنائی سی ہے اور اگرچہ اب یہ بہت کم ہوتی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی کام کرنے والوں کی مشکلات میں اس سے کچھ نہ کچھ اضافہ ہوجاتا ہے۔

یہ مشکلات اس قدر دل شکن اور مایوس کن ہیں کہ جب تک ان کے رفع کرنے کے لئے استقلال اور ہمت سے کام نہ لیا جائے گا۔ ثانوی تعلیم کی ترقی ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مدارس میں مسلمان طلبہ سے نصف فیس وغیرہ کی جو رعایت کی جاتی ہے وہ ہرگز کافی نہیں۔ اس سے ان کی تعداد میں نہ کچھ اضافہ ہوتا ہے ورنہ اعلیٰ تعلیم کی ترغیب پیدا ہوتی ہے ۱۸۸۲ء کے مشہور تعلیمی کمیشن نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق یہ قرار دیا تھا کہ

سررشتہ تعلیمات کی ہر رپورٹ میں تعلیم مسلمانان کے لئے ایک علحدہ باب مخصوص کر دیا جائے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانان مدراس کی یہ بڑی خواہش ہے کہ اس کام کے لئے ناظم تعلیمات کا ایک خاص مددگار ہو جس کا درجہ یوروپین مدارس کے انسپکٹر کے مساوی ہو اور اس کا تعلق راست ناظم تعلیمات سے رہے۔ اور یہ کہ اسلامی مدارس کا ویسا ہی خاص لحاظ رکھا جائے جو یوروپین اور یوریشین مدارس کا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بنگال میں ایسے عہدہ دار کا تقرر ہوا ہے۔

اپریل ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے پھر ایک سرکلر جاری کیا جس میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں نے ابتدائی تعلیم میں خاصی ترقی کی ہے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم میں وہ بہت پیچھے ہیں۔ اور اس بارے میں گورنمنٹ نے یہ مشورہ دیا کہ مکتبوں میں دینوی تعلیم کے رواج کی ترغیب دی جائے۔ جہاں کہیں ضرورت ہو اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے اور نیم مکتب مدرسوں میں خاص نصاب تعلیم مقرر کیا جائے۔ موجودہ مدرسوں اور اسلامی کالجوں اور اسکولوں کی اصلاح کی جائے اور مناسب مقامات میں مسلمانوں کے لئے جدید مدارس قائم کئے جائیں اسلامی دار الاقامہ مسلمان مدرسین اور انسپکٹر مقرر کئے جائیں نیز مدارس اور کالجوں کی انتظامی کمیٹیوں میں ایک واجبی تعداد مسلمانوں کی بھی ہونی چاہئے۔

اگر ۱۸۸۲ء کے کمیشن اور اس سرکلر کی منشاء کے مطابق ہم ان امور کا مطالبہ کریں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ میرا اس سے ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم اپنی یہ درخواست بھکاریوں کی طرح سرکار کے سامنے لے کر جائیں یا ہم اس کا مطالبہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں بطور خاص رعایت کے کریں۔ بلکہ ہمارا یہ مطالبہ ہندوستان کے عام فوائد کے لئے نیز دوسری اقوام اور گورنمنٹ دونوں کے حق میں بہتر اور مفید ہوگا۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ ہم گورنمنٹ کی نظروں میں حقیر

ہوں، یا اپنے دوسرے بھائیوں کے نقصان میں ہوں۔ یہ فعل ہماری خودداری کے منافی اور دوسری اقوام کے حق میں غیر منصفانہ ہوگا۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ دیانت بہترین طرزِ عمل ہے، خواہ اس کا تعلق افراد کی خانگی زندگی سے ہو، یا اقوام کی سیاسی زندگی سے اور ہم مختلف اقوام جو ایک ملک ایک آب وہوا اور ایک حکومت کے ماتحت رہتے ہیں تو ہمارا یہ ارادہ رہنا ہی ایک قسم کا معاہدہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے معاون، ایک دوسرے کے بہی خواہ اور ایک دوسرے کے نازبردار رہیں۔

یہ خالی الفاظ نہیں بلکہ میرا دلی عقیدہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اس تدبیر سے زیادہ مقدم اور زیادہ اہم اس اصول کو سمجھتا ہوں کہ مسلمان اپنی مدد کے لئے خود آمادہ ہوں اور اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا سیکھیں تاکہ دوسروں کے دست نگر اور محتاج نہ رہیں۔ چونکہ مسلمان ملک کے مختلف حصوں میں منتشر اور متفرق ہیں اور مدراس جیسے احاطہ میں اُن کی تعداد بہت قلیل ہے، لہٰذا اُن کا یہ فرض ہے کہ تعلیمی اغراض کے لئے ہر قسم کا بار اٹھائیں اور مشقت سہیں۔ اور ایسی حالت میں میں اس بات کی شدید ضرورت سمجھتا ہوں کہ آپ صاحب اس امر پر غور کریں۔ کہ آیا یہ مناسب ہو گا کہ مسلمان گورنمنٹ سے یہ درخواست کریں کہ ان پر ایک تعلیمی سیس اسٹکس کے ساتھ اضافہ کر دیا جائے جو وہ زر مال گزاری یا انکم ٹکس یا کسی اور ذریعہ سے سرکار کو ادا کرتے ہیں۔ اور وہ تمام رقم مسلمانوں کی تعلیم پر صرف کی جائے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس قسم کی تجاویز قطعی طور سے طے کی جائیں یا کوئی درخواست گورنمنٹ میں پیش کی جائے یہ ضرور ہے کہ اعداد و شمار اور وسائل و ذرائع کی کامل تحقیقات کرلی جائے۔ ایک دوسری تجویز جو اس سے زیادہ آسان اور بہتر نظر آتی ہے وہ یہ کہ ہندوستان کے اکثر مقامات کے سوداگر بعض مذہبی یا خیراتی

کاموں کے لئے فی روپیہ ایک پیسہ یا آدھ پیسہ اپنے خریداروں سے لیتے ہیں۔ یہ قلیل جو کسی پر گراں نہیں گزرتا لیکن تھوڑا تھوڑا بہت کچھ ہو جاتا ہے اور اس کی نظیریں موجود ہیں کہ اسی حقیر رقم کے بدولت بڑے بڑے عظیم الشان کام وجود میں آگئے ہیں۔ کیا وانیم باڑی اور مدراس کے مسلمان سوداگر اس طریقہ کو اپنے ہاں جاری نہیں کر سکتے ؟ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس پر ضرور غور کریں۔ میری قطعی رائے ہے کہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی تعلیم کے خاص مسئلہ کے حل کرنے کے لئے اس سے بہتر اور موثر کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔

اسی ضمن میں آپ کی توجہ اُن الفاظ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو گورنمنٹ آف انڈیا کی رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء میں مسلمانوں کی عام تعلیمی حالت کے متعلق درج ہیں۔ گورنمنٹ انڈیا نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ بعض صوبوں کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سرکاری مدرسوں میں زیادہ خواہش سے داخل ہوتے ہیں اور اسلامی مدارس میں داخل ہونے سے احتراز کرتے ہیں۔ اور اگرچہ مدراس میں مسلمان طالب علموں کی تعداد میں قابل اطمینان ترقی ہوئی ہے تاہم خاص اسلامی مدارس میں ان کی تعداد تخمیناً دس ہزار کم ہو گئی ہے۔

بمبئی کے اسلامی ہائی اسکول کی نسبت یہ معلوم ہوا ہے کہ باوجود بہت سے فوائد کے خوش حال والدین اپنے بچوں کو دوسرے مدارس میں بھیجنا زیادہ پسند کرتے ہیں ناظم تعلیمات صوبہ برہما نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آیا مسلمان درحقیقت تعلیمی معاملہ میں غفلت کرتے ہیں۔ یہ کہا ہے کہ اُن کی غفلت صرف اس بات میں پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو خالص اسلامی مدرسوں میں بھیجنا نہیں چاہتے۔ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے اس

خیال کے متعلق کسی رائے کا اظہار کرنا نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ وانیم واڈی، ہائی اسکول کی ترقی عمدہ تعلیم و تربیت اور ہر دلعزیزی ہمیں اس امر سے باز رکھتی ہے کہ گورنمنٹ کی اس رائے کا اطلاق عام طور سے ہر اسلامی مدرسہ پر کیا جائے۔ یہ بہت اہم مسئلہ ہے اور اس کانفرنس کے ....

منتظمین مدارس اور اُن جماعتوں کا جن کی نگرانی میں یہ مدارس ہیں یہ فرض ہے کہ اس معاملہ کی پوری تحقیقات کریں اور دیکھیں کہ آیا مسلمان بچے ان مدارس میں اس لئے داخل نہیں ہوتے کہ وہ اسلامی مدرسے ہیں یا اس وجہ سے کہ ان مدارس میں انتظامی خرابی قابل مدرسین اور سامان کا نہونا یا ڈسپلن کی کمی یا کسی اور قسم کا کوئی نقص ہے۔ گورنمنٹ کے ان الفاظ سے اسلامی مدارس پر بڑا حرف آتا ہے اور اس کی صفائی کرنا ہم پر لازم ہے۔

حضرات! ثانوی تعلیم کی حیثیت عجیب و غریب ہے یہ ابتدائی اور یونیورسٹی تعلیم کے بین بین ہے اسی پر اعلیٰ تعلیم کی کامیابی اور ملک کی عام بہبودی کا دارومدار ہے تعلیم کا یہی درجہ ہے جہاں سے نوجوان طالب علم مختلف پیشوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں داخل ہوتے ہیں اور جو تعلیم انہوں نے حاصل کی ہے اس کا اثر حیات کے تمام مدارج پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے تمام مہذب ممالک میں ثانوی تعلیم پر انتہا درجہ کا غور و خوض کیا گیا ہے۔ نصاب تعلیم کے قائم کرنے میں بڑی بڑی کاوشیں کی گئی ہیں۔ اگر ان ممالک کی گزشتہ پچاس سال کی تعلیمی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تعلیم میں کس قدر انقلاب پیدا ہوا ہے اور باوجود ان تمام تغیرات و اصلاحات کے یہ مسئلہ ابھی تک زیر بحث ہے اور اس کی اصلاح کا مطالبہ برابر جاری ہے یہ بحثیں نہایت مفید ہیں یہ مطالبے نہایت ضروری ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں پرنس بسمارک نے یہ کہا تھا کہ "اگر میں

اپنی قوم میں اس تیاری کو نہ پاتا جو مدارس ثانوی کی تعلیم نے پیدا کر دی تھی تو مجھے یقین نہیں کہ مجھے اپنے کام میں یا اس کام میں جس میں میں نے حصہ لیا ہے، کبھی ایسی کامیابی ہوتی" اور حقیقت یہ ہے کہ جرمن اتحاد میں جرمن مدارس اور جرمن مدرسین نے بہت بڑا کام کیا ہے اور اسی تعلیم پر ہماری قسمت کا بھی فیصلہ ہے۔

تعلیم یونیورسٹی

ثانوی تعلیم سے گزر کر جب میں یونیورسٹی کی تعلیم پر نظر ڈالتا ہوں تو مسلمانوں کی حالت اور بھی پست نظر آتی ہے۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ ۱۴ء میں ایم۔ اے میں صرف ایک مسلمان طالب علم شریک ہوا اور کامیاب رہا۔ بی۔ اے میں چار شریک ہوئے۔ جن میں سے تین کامیاب ہوئے۔ ال ٹی میں دو شریک ہوئے۔ اور دونوں کامیاب رہے۔ ایف۔ ال میں چار میں سے تین کامیاب اور بی۔ ال میں دو شریک ہوئے اور دونوں ناکامیاب رہے۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ۹۵ میں سے صرف ۲۵ کامیاب ہوئے ۱۵ء میں ایم۔ اے میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ بی۔ اے میں ۲۳ میں ۸ نئے قواعد کے تحت میں ۹ میں سے ۵۔ ایف۔ ال میں تین ... بی ال میں ۵ میں سے ایک انٹرمیڈیٹ میں ۱۳۱ میں سے ۲۵ کامیاب ہوئے گزشتہ سال کے نتائج ۱۴ء کے مقابلہ میں اور بھی خراب رہے۔ تعداد ان مسلمانوں کی جو کالج میں تھے بمقابلہ ان کے جو مدارس ثانویہ میں تھے اُن کی فیصدی ۹، ۲ تھی اور ہندوؤں کی ۶، ۷ برہمن طلبہ کی فیصدی کالج میں ۶، ۱۱ تھی۔ یہ نتائج اور یہ تعداد بہت مایوس کن ہیں لیکن مجھے کامل اُمید ہے کہ جب وانیم واڈی ترقی پاکر جنوبی ہند کا علی گڑھ بن جائے گا تو ہماری تعلیمی پسماندگی کی صورت بدل

جائے گی۔ اور جس طرح علی گڑھ کالج کے قیام سے صوبجات متحدہ میں مسلمانوں کی تعلیم کا رنگ بدل گیا اسی طرح ایک روز وہ بھی آئے گا کہ اس کی بدولت اس حصہ ملک میں مسلمانوں کی تعلیم یونیورسٹی میں نمایاں اضافہ ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی سکیم کا (جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے) ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ اس سرمایہ میں سے غریب ہونہار طالب علموں کو وظائف دیے جائیں گے تاکہ وہ اپنی تعلیم کالج میں جاری رکھ سکیں۔ اور یہی وہ طالب علم ہوں گے جو اس کام کو جاری رکھیں گے اور ملک میں تعلیم اور روشن خیالی پھیلانے کا ذریعہ ہوں گے۔ لیکن کیا ایسی قلیل تعداد سے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ ہماری یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے؟ جب تک ہم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد کثرت سے نہ ہوگی ہم ہرگز اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ ہماری اس تعلیمی پستی کی ایک وجہ اور بھی بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ قابل مسلمان تعلیمی ملازمت میں جانا پسند نہیں کرتے اور لائق مسلمان مدرسین کی عموماً کمی پائی جاتی ہے۔ جب تک ہم میں مسٹر ابراہیم قریشی جیسے بے ریا اور مخلص کام کرنے والے بہت سی تعداد میں نہ ہوں گے۔ جب تک ہم میں سے کچھ دنیاوی جاہ طلبی کو چھوڑ کر مشنریوں کی طرح اس کام کے لئے اپنے تئیں وقف نہ کر دیں گے۔ ہم گذشتہ غفلت اور پسماندگی کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اس تعلیمی پستی اور دماغی بے حسی سے جو بڑا خطرہ پیدا ہونے والا ہے وہ یہ ہے کہ کہیں ہم اُن قوائے کے استعمال سے جو خداوند تعالیٰ نے ہم میں نیکی کے لئے ودیعت کئے ہیں، محروم نہ ہو جائیں۔ اس بڑے خطرہ کا دفع کرنا اور ان قوائے کا صحیح استعمال ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے جنہوں نے اپنے ملک و قوم کے حالات پر غور کیا ہے جنہوں نے پاک اور روحانی لٹریچر کا مطالعہ فرمایا ہے۔ اور جن کے دلوں میں بنی نوع انسان کی ہمدردی کی آگ سلگ رہی ہے۔

غالباً اسی نظر سے مسلمان ایک عرصہ سے اسلامی یونیورسٹی کا خیال پکار رہے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے قائم ہونے کے بعد ہی سر سید احمد خان مرحوم نے اس مسئلہ کو پیش کیا۔ وہ اس رمز کو خوب سمجھتے تھے کہ جب تک ہماری یونیورسٹی نہ ہو گی ہم ایسے لوگ پیدا نہیں کر سکتے جو ملک میں تہذیب، ذوق اور روشن خیالی پھیلائیں، جو قوم اور گورنمنٹ دونوں کے مفید ہوں اور جن میں حب وطن اور ایثار کا مادہ ہو، جن کی زندگی سادہ اور خیالات اعلیٰ ہوں۔ زمانہ کی ناماعدت سے یہ خیال صرف کاغذ پر رہا۔ چند سال ہوئے کہ چند باہمت بہی خواہان قوم نے اس خیال کو عمل میں لانے پر کمر باندھی اور ملک کے ہر گوشہ سے اس کے استقبال کے لئے صدائے لبیک بلند ہوئی۔ جس جوش و خلوص کے ساتھ مسلمانوں کے ہر طبقہ نے اس میں مدد دی ہے اس کی نظیر ہندوستان کے اس زمانہ کے مسلمانوں میں نہیں ملتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی یونیورسٹیوں کے قیام کی ایک ہوا سی چل گئی۔ ہندو یونیورسٹی کو چارٹر مل گیا ہے۔ میسور یونیورسٹی کی تکمیل میں تھوڑی سی کسر باقی ہے، پٹنہ۔ ڈھاکہ۔ رنگون ناگپور میں یونیورسٹیوں کے قیام کا مسئلہ زیر غور ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے متعلق بہت سے سرگرم مباحثے ہو چکے ہیں اگرچہ اس کے قیام میں تاخیر ہوئی ہے۔ لیکن یہ تاخیر فائدے سے خالی نہیں۔ مجھے اس یونیورسٹی کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے میری رائے فرقہ واری یونیورسٹیوں کے متعلق صاف ہے۔ اور اس سے قبل میں کئی بار اس کا اظہار کر چکا ہوں میں اصولاً ایسی یونیورسٹیوں کے قیام کو پسند نہیں کرتا جو کسی خاص فرقہ یا مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔ لیکن جب کہ ہندو مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی یونیورسٹیاں جدا جدا قائم کریں۔ تو میں نے بھی سر تسلیم خم کر دیا اور

اس وقت سے میں نے ایسی یونیورسٹیوں کی ترقی ونشو ونما میں جہاں تک میرے امکان میں تھا امداد دینے سے دریغ نہیں کیا جو قوم کی سچی ترقی کے حامی ہیں اور جو ساتھ ہی اُن عیوب کے رفع کرنے یا کم کرنے میں ساعی ہوں جو فرقہ داری یونیورسٹی کے ساتھ لزوماً پائے جاتے ہیں، اور خصوصاً ایک ایسی یونیورسٹی کی امداد میں مجھے کم تامل ہو سکتا ہے۔ جیسی کہ مسلمانوں کی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی قوم ہے جو علم و فراغت میں دوسروں سے پیچھے اور ملک کے مختلف حصوں میں متفرق ومنتشر ہے۔ غرض اس کے متعلق بہت سے سرگرم اور پرجوش مباحثے ہو چکے ہیں۔ بہت کچھ اختلاف رائے کا اظہار ہو چکا ہے اس کے بعد سکون کی کافی مدت مل گئی ہے۔ جس میں ہم آزادی اور اطمینان کے ساتھ ان اہم اور اصل مسائل پر غور کر سکتے ہیں۔ جو یونیورسٹی کی روح روان ہیں اور جن کے بغیر یونیورسٹی کے افادہ کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس بات کے معلوم ہونے سے خوشی ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ اب جو کانسٹی ٹیوشن بنے گا۔ اس سے مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی تشفی ہو جائے گی اور کم سے کم اس میں ہندوستان کے تمام صوبوں کے فوائد کا لحاظ رکھا جائے گا تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ ہم سب کی یونیورسٹی ہے۔ اور کسی ایک صوبہ یا کسی خاص خیال کے حضرات کی نہیں ہے اور جس طرح علی گڈھ کالج کا یہ فخر رہا ہے کہ اُس کے طالبعلم خاص مردانہ اوصاف اور روشن خیالی کے جوہر رکھتے ہیں۔ اُسی طرح مسلم یونیورسٹی کی ڈگری بھی اُن تمام شریفانہ اوصاف اور روشن خیالی کا تمغہ خیال کی جائے گی۔

تعلیم نسوان

مجھے شاید اس امر کے یاد دلانے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے کہ مدارس کے اثر

کی ایک حد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم قومی زندگی کی نشو ونما کے لئے لابدی ہیں لیکن اس کے لئے محض مدارس پر بھروسہ کرنا کافی نہیں۔ بچے کی زندگی کا سب سے نازک اور عجیب زمانہ اُس کے ابتدائی سال ہیں۔ اس لئے گھر کی تربیت قومی تعلیم کا ناگزیر جزو ہے۔

تعلیم کے مختلف مدارج اور مراحل آپس میں ایک دوسرے سے ایسے گتھے ہوئے ہیں کہ ایک کی تکمیل بغیر دوسرے کے نہیں ہو سکتی اور ایک کے اثر سے دوسرا بچ نہیں سکتا۔ یونیورسٹیاں اس وقت تک سرسبز نہیں ہو سکتیں جب تک اعلیٰ درجہ کے مدارس ثانوی ان کی مدد کے لئے نہوں۔ مدارس ثانوی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک تعلیم ابتدائی مدارس میں احتیاط کے ساتھ نہو لیکن تعلیم کے یہ سب مدارج اُس وقت تک پورے طور پر بار آور نہیں ہو سکتے۔ جب تک گھر کی تربیت درست نہو۔ غرض قومی تعلیم کی اصل بنیاد گھر کی تربیت پر ہے۔ اگر والدین اپنا فرض ادا نہیں کرتے اور اپنا پیچھا چھوڑاتے یا اپنے فرض سے بچنے کے لئے بچوں کو مدرسہ بھیج دیتے ہیں تو ایسی حالت میں مدرسوں سے بہت زیادہ توقع رکھنا عبث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس موقع پر آپ کو تعلیم نسوان کی طرف خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ مجھ پر کیا منحصر ہے۔ ہم میں کون شخص ہے جو مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق بحث کرنے کے لئے کھڑا ہو۔ اور تعلیم نسوان کا ذکر چھیڑ جائے؟ یا کون ایسا شخص ہے جو تعلیم کا حامی ہو اور تعلیم نسوان اس کے پروگرام میں داخل نہ ہو؟ طریقۂ تعلیم، نصاب تعلیم یا دیگر تفصیلی امور میں اختلافات کا ہونا ضرور ہے لیکن نفس تعلیم سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ مجھے سرکاری رپورٹوں میں یہ پڑھ کر حقیقی مسرت ہوتی ہے کہ مدراس میں تعلیم نسوان نے قابل تعریف ترقی کی ہے ۱۹۱۲ء کی رپورٹ میں

یہ تحریر ہے کہ گزشتہ دو سال میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد دگنی ہو گئی ہے ۱۹۱۵ء میں اس میں کچھ اور اضافہ ہوا مدارس ثانویہ میں ۱۹۱۴ء میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد ۱۴۰ تھی ۱۹۱۵ء میں بڑھ کر ۱۸۳ ہو گئی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ تعداد ابتدائی تعلیم کی ہے۔ اس میں کتنی ہوں گی جنہیں ہم خواندہ کہہ سکتے ہیں۔ اور کتنی ایسی ہوں گی جو اس تعلیم کے پانے کے بعد اپنے گھروں میں مطالعہ کا شوق جاری رکھتی ہوں گی۔ اور پھر کتنی ایسی ہوں گی کہ جنہیں گھر کے دھندوں میں پڑ کر لکھا پڑھا یہ کچھ بھی یاد رہتا ہوگا۔ اغلب یہ ہے کہ اس معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد ان میں سے اکثر تھوڑے ہی عرصہ میں پھر جاہل کی جاہل ہو جاتی ہوں گی۔ میں موجودہ حالت میں ڈاکٹر واک زاٹ کے ان پرزور الفاظ سے متفق ہوں جو انہوں نے اپنی تقریر میں فرمائے تھے وہ کہتے ہیں۔

"ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیئے کہ ہماری شدید ترین ضرورت عورتوں کے لیئے یونیورسٹیاں قائم کرنا، یا ان کا موجودہ زمانہ کے سائنٹیفک ایجادات و اختراعات میں حصہ لینا یا عورتوں کے واسطے اعلیٰ پیشوں کے لیئے راہ نکالنا نہیں ہے۔ بلکہ ان ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کے لیئے تعلیم کی توسیع کرنا اور اسے باحتیاط انجام دینا ہے جو آئندہ نسلوں کی مائیں ہونے والی ہیں۔" کون ہے جو ان الفاظ سے اتفاق نہ کرے گا۔ مانا کہ ہم نے اپنی لڑکیوں کے لیئے کالج اور یونیورسٹیاں قائم نہیں کیں، لیکن کیا ہم اپنے ایمان سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ان کی تعلیم کی توسیع و اشاعت کا فرض کما حقہ ادا کیا ہے اور کیا ہم نے صحیح معنوں میں انہیں اس قابل کر دیا ہے کہ "وہ آئندہ نسلوں کی مائیں بن سکیں" "آئندہ نسلوں کی ماؤں" کا جملہ نہایت پر معنی ہے اور اس میں تعلیم کا نہایت وسیع اور کامل مفہوم مضمر ہے۔ ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیئے کہ آئندہ نسلوں کا زمانہ تعلیمی اقتصادی و دیگر حالات کے

وجوہ سے کس قدر زیادہ ترقی یافتہ اور بہتر ہوگا۔ اُن نسلوں کے لئے ماؤں کا تیار کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اور اگر ہم اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہے تو یاد رہے کہ ہم پھر کئی قرن پیچھے رہ جائیں گے لیکن جب میں تعلیم نسوان کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ کام مشکل نظر آتا ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر حصے میں تعلیم نسوان کا چرچا ہے لیکن جہاں تک مجھے خیال ہے کبھی اس اہم مسئلہ پر غور کرنے کے لئے باقاعدہ اور سچی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ ہر شخص نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے ہر جگہ تعلیم جداگانہ ہے کبھی یہ کوشش نہیں کی گئی کہ تعلیم نسوان کے نصاب پر کامل طور سے غور کیا جائے۔ انتظامی لحاظ سے کوئی تعلق ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ کو نہیں ہے غرض طریقہ تعلیم و نصاب تعلیم ناقابل اطمینان، معیار تعلیم پست، انتظامی حالت بے ترتیب و بے ترکیب ہے اور آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے اکثر مدرسے ایسے ہیں جنہیں مدرسے کہتے ہوئے عار معلوم ہوتی ہے۔ کیا ایسی صورت میں ہم تعلیم نسوان کا کسی طرح بھی دعویٰ کر سکتے ہیں ؟ کیا ایسی صورت میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ اصلاح کی شدید ضرورت نہیں ہے ؟ میں اس موقع پر اس واجب الاحترام خاتون کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو درحقیقت اپنی تعلیمی سعی و ہمدردی اپنی نیکی اور فیاضی کی وجہ سے ہمارے قوم کے لئے باعث فخر ہے اور جس کی حکومت سے ریاست بھوپال کو بجا ناز ہے ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم خلد اللہ ملکہا نے علاوہ دیگر اصلاحات و مساعی کے جو تعلیم نسوان کے بارے میں فرمائیں۔ ایک اسکیم نصابِ تعلیم کے متعلق تیار کر کے شائع کی لیکن افسوس ہے کہ ہماری قوم نے غفلت کی وجہ سے اس پر اس قدر توجہ نہیں کی جس کی وہ مستحق تھی۔

حضرات! کیا ایسی حالت میں کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ اصلاح و توسیع تعلیم نسوان کے

لئے نہایت مستعدی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے؟ میری یہ رائے ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ صاحب مجھ سے اتفاق فرمائیں گے کہ اس اعلیٰ اور ضروری غرض کے لئے ایک مجلس کے قائم کرنے کی ضرورت ہے اگرچہ موجودہ حالات کی رُو سے تمام ہندوستان کے لئے کسی ایک مرکزی مجلس کا قائم کرنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہر صوبہ اور ہر حصے میں اس قسم کی مجلسیں قائم کی جائیں جو مقامی ضروریات کے لحاظ سے اس مسئلہ پر کامل غور کریں اور تعلیم نسوان کی توسیع و اشاعت کی تدابیر پر مباحثہ کریں۔ اور ممکن ہو تو تعلیم یافتہ خواتین سے بھی اس میں رائے لیں کیوں کہ تعلیم نسوان کی ترقی اسی وقت ممکن ہے کہ جب اس مسئلہ کو خود خواتین اپنے ہاتھ میں لیں گی۔ اس وقت تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین کی کمی ہے۔ اس لئے فی الحال مردوں ہی کو یہ کام کرنا پڑے گا میں اس اہم مسئلہ کے تفصیلی امور پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن بعض مسائل مختلف فیہ مثلاً نسوان کا نصاب تعلیم وہی ہونا چاہئے جو مردوں کا ہے یا مختلف، کیا نسوان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمارے یونیورسٹی کے امتحانات کے لئے تیار کی جائیں۔ یا نصاب تعلیم کی تیاری کس نہج پر کی جائے یا معلمات کیوں کر دستیاب کی جائیں وغیرہ ایسے معاملات ہیں کہ وہ قابل اور ہمدرد تعلیم یافتہ حضرات اور خواتین کی مجلس میں طے ہو سکتے ہیں اور ان کے متعلق ملک کے ہر حصہ کے ہمدرد و روشن خیال اصحاب سے جنہیں اس مسئلہ سے خاص دلچسپی ہے رائیں طلب کی جا سکتی ہیں۔

حضرات! اگر میں آپ صاحبوں سے جو یہاں تشریف رکھتے ہیں یہ درخواست کروں تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ جہاں آپ اپنی یا اپنے لڑکوں کی تعلیم کی کوشش کرتے ہیں، اگر آپ اس کے ساتھ یہ بھی تہیہ کریں کہ اپنی بیویوں بیٹیوں اور بہنوں کو بھی اسی طرح تعلیم دیں گے

تو یہ ایک ایسی برکت ہوگی کہ جس کے فوائد بیان میں نہیں آسکتے۔ اگر زیادہ نہیں تو صرف یہی بات ہم دل پر رکھ لیں کہ ہم کم سے کم ایک عورت کو خواہ وہ ہماری بیوی ہو یا بیٹی یا بہن تعلیم یافتہ بنا دیں گے تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ صرف اس ایک ترکیب سے ہماری قوم میں کس قدر روشن خیالی بڑھ جائے گی۔ اور اس سے ہماری سچی مسرت میں کس قدر اضافہ ہو جائے گا۔

میں نہیں چاہتا کہ ہماری لڑکیاں خواہ مخواہ یونیورسٹیوں کے امتحانات پاس کریں اور ان کا نصب العین سندیں حاصل کرنا ہو۔ (اور جو ایسا کرسکتی ہیں مجھے اس سے تعرض نہیں) لیکن میری اصلی خواہش یہ ہے کہ اُن میں روشن خیالی ہو، مطالعہ کا ذوق ہو اپنے فرائض اور امور خانہ داری سے واقف ہوں۔ اپنے مذہب اپنے ملک و قوم سے محبت ہو اور مختصر یہ کہ آئندہ نسلوں کی حقیقی مائیں ہوں۔

میں نے اس مسئلہ پر کسی قدر زیادہ آپ کی سمع خراشی کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہماری اصلی ترقی سے اس قدر وابستہ ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ بھی کم ہے میں آخر میں اس مسئلہ کے متعلق ڈاکٹر لنگن کے ان قابل قدر الفاظ کے سنانے کی اجازت چاہتا ہوں جو ہمیں ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔ وہ کہتے ہیں۔

" ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم عورت کو محض ایک عورت کی حیثیت سے نہ دیکھیں یعنی مثل مرد کے مددگار، بچوں کی ماں، کام کرنے والی کی حیثیت سے جو مصیبت کی ماری اپنی گزر اوقات کے لئے مزدوری کرنے پر مجبور ہے۔ بلکہ اُسے بنی نوع انسان کا ایک رکن خیال کریں جو دوسرے انسانوں کی طرح حقوق رکھتی ہے۔ ہم سب اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک نوجوان شخص خواہ امیر ہو یا غریب خواہ اس کا منشا کسی پیشہ کے کرنے کا ہو یا نہ ہو

اس کا یہ مقدس اور شریفانہ فرض ہے کہ تا حد امکان اُن قوائے دماغی کی اعلیٰ تکمیل کرے جو فطرت نے اُسے ودیعت کیے ہیں تاکہ جہاں تک ممکن ہو وہ کمالِ انسانیت تک پہنچ سکے۔

اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ مردوں کو کیا حق ہے کہ وہ لڑکیوں کو اس مقدس اور شریفانہ فرض کے بجالانے سے روکیں؟ برخلاف اس کے ہم کیوں اس فرض کے بجالانے کو اُن کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل کر دیتے ہیں؟ کیا یہ ایسا ہی نہیں کہ گویا ہم ایک خوبصورت درخت کے اوپر کے حصے کو کاٹ ڈالتے ہیں کہ وہ سُورج کے روشنی تک نہ پہنچ سکے؟ کیا ہم بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصے کو روحانی غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑ رہے ہیں؟ کیا ہم دانستہ عورتوں کو شریف ترین و اعلیٰ ترین نیکی یعنی روحانی آزادی سے محروم نہیں کر رہے ہیں؟ .... اب ہمیں چاہئے کہ صدہا سال کا قرض جو ہمارے ذمہ ہے اسے ادا کرنا شروع کریں اور عورتوں کے جسمانی حسن و جمال پر شائستہ ذہانت کا حسن اضافہ کریں ہمیں چاہئے کہ ان کی آنکھوں سے پٹی ہٹا کر اُنہیں سرچشمۂ علم تک لے جائیں تاکہ وہ بھی ازمنہ ماضی و حال کی عقل و حکمت میں حصہ لے سکیں، لغو اور فضول باتوں اور بیہودہ بکواس سے احتراز کریں اور اعلیٰ ترین اور شریف ترین انسانی مسرت یعنی دماغی کامیابی کا لطف اٹھا سکیں۔"

کتب خانے

حضرات! اب تک میں نے تعلیم کے مختلف شعبوں پر بحث کی ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ تکمیلِ دماغ بلکہ تکمیلِ انسانیت کے لئے صرف مدارس کافی نہیں ہیں ہمیں

ان کے ساتھ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے اور منجملہ ان کے ایک کتب خانے ہیں میں اسے اشاعت تعلیم اور دماغی ترقی کے لئے نہایت ضروری سمجھتا ہوں اور خصوصاً نوجوانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ ترقی نہیں ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اردو اور انگریزی کی عمدہ ادبی کتب خانے کے لئے کسی زیادہ رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میری یہ رائے ہے کہ ہر ابتدائی مدرسہ نہ صرف بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم کا ذریعہ ہو بلکہ ان بچوں اور ان کے والدین کے لئے بھی تحصیل ذوق کا وسیلہ ہونا چاہئے۔ ایک معمولی اور آسان طریقہ ان کتب خانوں کی امداد کا یہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے اخبار اور رسالے جو ہم امداداً خریدتے ہیں اور جن کے پڑھنے کے لئے ہمیں بہت کم وقت ملتا ہے ہم ان کتب خانوں کو دے دیا کریں تاکہ غریب طالب علم اور کم استطاعت لوگ ان سے مستفید ہوسکیں۔

کتب خانوں کے فوائد ایسے نہیں کہ اعداد و شمار سے بتائے جاسکیں لیکن وہ اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنی زندگی میں اکثر ایسے صاحبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا کہ جن کی تعلیم محض ابتدائی یا کم درجہ کی ہوئی ہے مگر صرف کتب خانوں کی بدولت اور مطالعہ کے ذوق سے ان کا علم و فضل اس پایہ کا ہے کہ وہ ان لوگوں سے بدرجہا افضل ہوگئے ہیں جو ڈگریاں تو اعلیٰ امتحانات کی رکھتے ہیں مگر مطالعہ کا شوق نہیں رکھتے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے دنیا میں بڑا نام پیدا کیا ہے اور بنی نوع انسان کے محسن ہوئے ہیں ہمارا فرض ہے کہ مدرسوں کی تعلیم کے ساتھ ہم طالب علموں میں ان کتب خانوں کے ذریعہ سے ذوقِ مطالعہ بھی پیدا کریں۔ کیوں کہ بغیر اس کے کوئی امتحان اور کوئی ڈگری قابل وقعت نہیں ہوسکتی۔

اُردو ٹائپ

اب میں آپ صاحبوں کی توجہ ایک اور چیز کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ ہمارے لیے نئی تو نہیں ہے مگر ہم نے کبھی خاص طور سے اس پر غور نہیں کیا ہے۔ میں جہاں سرسید احمد خان مرحوم کے اور احسانات کا اعتراف کرتا ہوں وہاں میں اُن کی اُس حیرت انگیز دُوراندیشی اور عاقبت بینی کا بھی قائل ہوں جو انہوں نے اردو ٹائپ کے بارے میں ظاہر کی۔ سرسید مرحوم نے ابتداء سے اُردو ٹائپ کی حمایت کی۔ علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ جو اب تک جاری ہے اور اُن کا قابل قدر رسالہ "تہذیب الاخلاق" جس کا مسلمانوں کے اخلاق و اصلاح پر بے انتہا عمدہ اثر پڑا اور اُن کی تصانیف سب اردو ٹائپ میں چھپتی تھیں اگرچہ ہم نے اس وقت اس کی قدر نہیں کی بلکہ ایک حد تک مخالفت کی۔ لیکن اب ہمیں اس کی قدر معلوم ہو رہی ہے زمانہ بدل گیا ہے اور بدلتا جاتا ہے۔ علم کی عام اشاعت کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اور اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اُن طریقوں کو اختیار کریں جو اس اعلیٰ مقصد میں سہولت پیدا کر سکتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے ممالک کا ذکر چھوڑئے خود ہندوستان کی اکثر زبانوں نے ٹائپ اختیار کر لیا ہے۔ لیتھو نے ہمارے علوم کی اشاعت میں جو کام کیا ہے میں اس کا احسان مندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں لیکن اب شدید ضرورت ہے کہ ہم ایک قدم اور آگے بڑھیں اور اپنی رفتار کو تیز کریں۔ بڑی وجہ اس امر کی کہ ہم کیوں ہندوستان کی دوسری زبانوں سے پیچھے رہ گئے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمیں نستعلیق خط بہت عزیز ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی خط حسن و خوبی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ ہمارے بزرگوں کے صنعتی ذوق اور محنت کی ایک ایسی

یادگار ہے جس پر ہمیں ہمیشہ فخر رہے گا مگر مشکل یہ ہے کہ موجودہ ٹائپ اس کا متحمل نہیں
ٹائپ کی بھدی مشین اس کے حسن اور نازک جوڑوں کو قائم نہیں رکھ سکتی اس لئے ہم مجبور
ہیں کہ نسخ کا ٹائپ اختیار کریں لیکن زمانۂ حال میں ایسے ٹائپ ایجاد ہوئے ہیں جو
نہایت خوبصورت ہیں اور نستعلیق سے قریب ہیں اور میں آپ کو یہ خوش خبری سناتا ہوں
کہ اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے جن کے احسانات ملک کے اکثر علمی کاموں اور تعلیمی
درس گاہوں پر بے انتہا ہیں ایک ایسے ہی عمدہ اردو ٹائپ کی ریاست میں رائج
کرنے کی منظوری عطا فرمائی ہے۔ اگر ریاست حیدرآباد دکن سے باہر بھی لوگوں نے
اس کے رواج دینے کی کوشش کی تو یہ سارے ملک کے لئے باعث برکت ہوگا۔
مجھے اس بات کے جتانے کی ضرورت نہیں کہ لیتھو کی وجہ سے کیسی کیسی مشکلات پیش آتی
ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ باوجود ہزار کوشش کے اردو کتاب صحیح نہیں چھپ
سکتی۔ اور اس سے مصنف کو جو دلی صدمہ ہوتا ہے اس کی کیفیت کوئی اس کے دل سے
پوچھے۔ علاوہ اس کے بین السطور کا بھدا پن حاشیہ کی عدم یکسانی تصحیح کی مشکلات اور
خصوصًا اردو روزانہ اخبار کی دقتیں سب یک لخت دور ہو جائیں گی اور کتابیں زیادہ صحیح
اور مقبول صورت میں چھپنے لگیں گی۔ اس کے سوا خوبصورت نسخ ٹائپ کے پڑھنے میں
نظر پر بھی زیادہ بار نہیں پڑے گا۔ اور چونکہ ہمارے ہاں بچوں کو شروع ہی سے قرآن شریف
پڑھایا جاتا ہے اس لئے انہیں ایسے خط کے پڑھنے میں ابتدا ہی سے زیادہ سہولت
ہوگی اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں نستعلیق کو مٹانا چاہتا ہوں میں اس کے حسن وخوبی کی
دل سے قدر کرتا ہوں۔ اردو ٹائپ کے رائج ہونے پر بھی وہ بدستور قائم رہے گا جس
طرح دنیا میں ہر جگہ طبع اور ویسے لکھنے کے دو دو خط ہیں اس طرح یہاں بھی دو رہیں گے

ٹائپ کی ضرورت طبع کی سہولت کے لئے ہے جو نا گزیر ہے میں مسلمانان جنوبی ہند کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ اردو زبان کے ذریعہ سے علم کی عام اشاعت کے حامی ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ملک میں صحیح سستی اور خوب صورت کتابوں کی اشاعت ہو تو وہ ضرور اس کے رواج دینے میں کوشش کریں۔

مسئلہ زبان

حضرات! قبل اس کے کہ میں اپنی ملکی زبانوں کے متعلق گفتگو کروں میں ایک ضروری امر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس پر میں نے مدتوں غور کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی اس پر غور فرمائیں گے بلکہ عمل میں لانے کی کوشش کریں گے ہم میں سے کون ہے جسے عربی زبان سے محبت نہیں صرف اس لئے نہیں کہ وہ ہماری مقدس زبان ہے (اور بے شک یہ بڑی اور قوی وجہ ہے) بلکہ اس لئے بھی کہ تہذیب ذوقِ اسلامی روایات اور تاریخی تعلقات اس سے وابستہ ہیں۔ اور دنیا کی نہایت فصیح وسیع اور کامل زبانوں میں سے ہے میں ان تمام وجوہ کی بنا پر ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے لئے اس کی تحصیل لازمی خیال کرتا ہوں۔ لیکن عام طور پر یہ زبان مشکل سمجھی جاتی ہے اور اس لئے اکثر نوجوان اس مشکل میں پڑنے سے بچتے ہیں۔ علاوہ دوسری سہولتوں کے جو اس کی تحصیل کے لئے پیدا کی جا سکتی ہیں میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہم ابتدائی جماعتوں سے لے کر کالج کے درجوں تک روزانہ صرف آدھ گھنٹہ ہر اسلامی مدرسہ میں عربی کی تحصیل میں صرف کریں تو مجھے یقین ہے کہ اگر طالب علم کو اس پر کافی قدرت حاصل بھی نہ ہوئی تو اس میں شک نہیں کہ اسے اس زبان سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو جائے گی۔ اور اس کے سمجھنے اور پڑھنے میں زیادہ دقت باقی نہ رہے گی

کم سے کم اگر وہ آدھ گھنٹے میں چند عربی جملے ہی حفظ کرلے گا تو اسے ایک مدت کے بعد خاص لگاؤ پیدا ہو جائے گا اس تدبیر کا عمل میں لانا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ اگرچہ یہ وقت بہت کم ہے لیکن اگر تمام مدت تعلیم پر حساب پھیلایا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے اور غور کرنے کے بعد ہم سمجھیں گے کہ اس کی منفعت کس قدر عظیم اور نتیجہ خیز ہوگی۔ البتہ طریقہ تعلیم کی اصلاح نہایت ضروری اور جدید طرز کی کتابیں جیسی مولوی حمید الدین صاحب صدر دار العلوم کی ہیں بہت کارآمد ہوں گی۔

میں اب زبان کے دوسرے مسئلہ پر آتا ہوں۔ انگریزی حکومت سے قبل یہاں اسلامی حکومت تھی اس زمانے میں علاوہ عربی کے فارسی زبان کی تحصیل کا مسلمانان مدراس کو خاص شوق تھا ان کی تمام خط و کتابت اور تعلیم فارسی میں ہوتی تھی۔ جنوبی ہند میں مدراسی مسلمان فارسی زبان کے جاننے میں خاص طور پر مشہور تھے اور کچھ عرصہ قبل تک ان کا شوق جاری رہا اور غالباً اب بھی ان میں اکثر فارسی دان موجود ہوں گے انگریزی سلطنت سے جہاں اور تغیرات ظہور میں آئے ایک بڑا تغیر یہ بھی ہوا کہ فارسی کی جگہ اردو نے لی اور وہ اس کی صحیح جانشین ثابت ہوئی۔ اہل مدراس نے ابتدا سے اس زبان کے سیکھنے اور رواج دینے میں کوشش کی۔ اردو زبان کی وہ ابتدائی صورت جو "دکنی" کے نام سے مشہور تھی اس میں ان کی تصانیف و تالیفات کثرت سے موجود ہیں۔ میں خوش ہوں کہ مسلمانان مدراس کو اس زبان کا بہت بڑا خیال ہے اور وہ اسے اپنی قومی زبان خیال کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے لئے یہ کوئی جدید زبان نہیں بلکہ ابتدا سے وہ اس کے حامی اور شائق ہیں یہ بھی کچھ کم خوشی کی بات نہیں کہ ملک کے دوسرے صوبوں کے مسلمان بھی جہاں ان کی مادری زبان اردو

نہیں اس زبان کی تحصیل میں کوشش کرتے ہیں اور سرکاری تعلیمی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ مدراس بمبئی، برہما۔ بنگال میں اس بات پر خاص زور دیتے ہیں کہ سرکاری مدارس میں اردو کی تعلیم جاری کی جائے۔ چنانچہ ان صوبوں میں یا تو اردو مدرسے جاری کر دیئے گئے ہیں یا جاری ہونے والے ہیں۔ اور سرکاری مدارس میں مسلمان طلبہ کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ ان مدارس میں سے اکثر میں اردو تعلیم کا انتظام نہیں۔ میری مسرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مسلمانان ہند نے ایک ایسی زبان کو اپنی قومی زبان بنایا ہے۔ جو خالص آریائی زبان ہے۔ اور جو اس عظیم الشان ملک کے ہر حصے میں بولی یا سمجھی جاتی ہے اور اس لئے یہ صرف مسلمانوں ہی کی زبان نہیں بلکہ ملک کی عام زبان ہے اور ہندو مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا ایک قوی ذریعہ ہے اور اس لئے اس کی تحصیل و ترقی میں کوشش کرنا نہ صرف بحیثیت مسلمان کے بلکہ بحیثیت اہل ہند ہونے کے ہمارا بہت بڑا ملکی فرض ہے کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہم وانیم باڑی میں بیٹھے ہوئے اپنی کانفرنس کی کارروائی اردو میں کر رہے ہیں اور کیا اہل مدراس کا شوق اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے مجھ سے خاص طور پر یہ خواہش کی کہ میں اپنا ایڈریس اردو میں پڑھوں اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت میں ان کی خواہش کے مطابق ان کے ارشاد کی تعمیل کر رہا ہوں۔

لیکن حضرات۔ اس کے ساتھ ہی میں آپ کو بتاکید یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ اس جوش اور شوق میں اپنی مقامی زبانوں کو نہ بھلا دیجئے۔ میں نہایت خوش ہوں کہ وانیم باڑی ہائی اسکول میں ان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ میں اس سے بڑھ کر کوئی آفت نہیں سمجھتا کہ مسلمان کسی ایسی مقامی زبان کو ترک کر دیں جس میں ان کی اور ان کے ہمسایہ قوم کی

زندگی بسر ہوئی ہے اور جن سے انہیں کاروبار اور معاشرتی معاملات میں تقریباً ہر روز ملنا جلنا پڑتا ہے اور جن کے ساتھ رہنا سہنا اور بسنا ہے میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور کسی طرح جائز نہیں رکھ سکتا کہ کسی ملکی زبان کا تعلق مذہب سے منسوب کیا جائے۔

اس بدنصیب ملک کی مختلف اقوام میں نفاق وعداوت کے اور اسباب کیا کم ہیں جو ایک نیا تناخسانہ کھڑا کیا جائے اور اس بھڑکتی ہوئی آگ میں تیل ڈالا جائے؟ تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ مسلمان تامل یا تلنگی کا شاعر ہے اور اس کے گیت جنوبی ہند میں ایسے ہی مشہور اور ہر دل عزیز ہوں جیسے سر رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت بنگال میں تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اس کا کس قدر عجیب وغریب اثر ہندوؤں کے دلوں پر ہوگا اور ان کی ہمدردی کس قدر مسلمانوں کے ساتھ بڑھ جائے گی۔ ہمارے دلوں میں جو انگریزوں کی وقعت ہے اور ان سے ایک قسم کی ہمدردی ہے اس کا منجملہ اور اسباب کے ایک سبب ان کا حیرت انگیز علم ادب ہے۔ شکسپیر۔ بیکن۔ برک یا بروننگ کے پڑھنے سے جو خیالات ہمارے دل میں موج زن ہوتے ہیں ان کی وجہ سے خود بخود ہم انگریزی قوم کے مداح ہو جاتے ہیں۔ میں نے جو عربی اور مقامی زبان کی تحصیل پر زور دیا ہے تو اس سے میرا یہ مقصد ہے کہ مسلمان اپنے مذہب پر ثابت قدم رہیں اپنے ملک سے محبت کریں اور ان دونوں کی عظمت پر فخر و ناز کریں اور اپنے ہم مذہبوں اور دیگر اہل مذاہب سے اعتماد و ہمدردی کا برتاؤ رکھیں۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ مغرب کے تمام مادی فوائد کو حاصل کریں لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ آپ اپنے مذہب اپنے لباس اور اپنی صنعت کو قائم رکھیں۔ میں مسٹر ایل ہرن کی پُرلطف کتاب "اوٹ آف دی ایسٹ" میں سے چند جملے سناتا ہوں جو

اس نے اِس کے متعلق لکھے ہیں وہ لکھتا ہے کہ "جو کچھ اس نے (جاپان) نے کیا ہے اور کر رہا ہے اس کے لکھنے کے لئے کئی دفتر چاہئیں مگر اس قدر کہنا کافی ہے کہ اوس نے ہماری صنعت و دستکاری ہمارے علمی سائنس۔ ہماری اقتصادی مالی اور قانونی تجربات میں سے بہترین حصہ انتخاب اور اختیار کیا ہے اور ہر صورت میں اعلیٰ نتائج حاصل کئے ہیں اور ہمیشہ ہمارے مستعار حصہ کو اپنی ضروریات کے مطابق نئی صورت میں ڈھال لیا ہے لیکن اس نے ہمارا مغربی لباس مغرب کی معاشرتی عادتیں مغربی فن تعمیر یا مغربی مذہب اختیار نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کے داخل ہونے سے اس کی قوت بجائے بڑھنے کے ضعیف ہو جاتی" لباس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "غیر ملکی لباس جاپانی عہدہ داروں نے اختیار کیا ہے لیکن وہ اسے صرف دفتر کے اوقات میں مغربی طرز کی عمارتوں میں پہنتے ہیں۔ جہاں جدید زمانے کی میزیں کرسیاں موجود ہیں ایک بار ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جاپانی نے میرے ایک دوست سے کہا کہ "ہم نے مغربی لباس صرف عارضی طور پر اختیار کیا ہے جیسے بعض جانور اپنی حفاظت کی غرض سے بعض موسموں میں خاص رنگ اختیار کر لیتے ہیں" میں خاص طور پر اپنے لباس اور عادات پر ثابت قدم رہنے کے لئے اس لئے زور دیتا ہوں کہ اس میں زیادہ کفایت شعاری ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنے لباس اور عادات پر قائم رہنے سے ہم درحقیقت اپنی سوسائٹی کے لئے زیادہ مفید ہو سکتے ہیں اور بیجا اسراف سے بچ کر اپنی قوت اپنے وقت اور روپیہ کو اچھے کاموں میں لگا سکتے ہیں۔

میں اس موقع پر یہ بھی جتانا چاہتا ہوں کہ اس طریقہ سے نہ صرف ہم اسراف سے بچتے ہیں بلکہ ہمارے اخلاق بھی برے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ جو لوگ محض نقالی کے طور پر دوسروں کی معاشرت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے اخلاق و اطوار پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور تجربہ سے

یہ معلوم ہوا ہے کہ انہیں اپنی قوم و ملک سے ایک اجنبیت سی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں اس بڑی تحریک کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی ضرورت کو اگرچہ اس سے بہت قبل میرے صوبہ کے افسر سر ڈیوڈ وڈربرن نے اپنے پمفلٹ موسومہ "ولیج بینکس فار دی دکن" میں ظاہر کیا تھا لیکن اس تجویز کو عمل میں لانے کی تعریف کے مستحق درحقیقت آپ کے صوبہ کے افسر سر فریڈرک نکلسن ہیں جن کی قابل قدر اور مستند رپورٹ اب ہمیں ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہے یہ تحریک مجلس ہائے امداد باہمی کی ہے۔ یہ تجویز اگر کامیابی کے ساتھ اور عام طور سے تمام ملک میں رائج ہو گئی تو ہندوستان کے لئے بہت بڑی موجب برکت ہو گی۔ جس طرح مسلمانوں کی تعلیم کے لئے آپ کو وانیم باڑی میں قریشی مدراس میں یعقوب حسن اور میسور میں غلامی مل گئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اسی طرح جنوبی ہند کے مسلمانوں میں ایک دوسرے قریشی پیدا ہو جائیں۔ جو اس نہایت مفید تحریک کے رائج کرنے کا بیڑا اٹھالیں۔ آپ میں سے جن صاحبوں نے پولیٹکل اکانمی کا مطالعہ فرمایا ہے تو مجھے یقین ہے کہ جس طرح تیس سال قبل راش ڈیل پائنیرز اور ریفن بائن کی کیفیت پڑھ کر میرے دل میں ایک عجیب ولولہ پیدا ہوا تھا وہی حالت آپ کی ہوئی ہوگی۔ کیا یہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ ایک سوسائٹی جس کا ابتدائی سرمایہ بہت ہی خفیف ہو وہ ایک ایسا عظیم الشان کام کر دکھائے کہ اس کے کارخانے بھی ہوں کتب خانے بھی ہوں اور ملنے اور جمع ہونے کے ہال بھی ہوں۔ یہ پڑھ پڑھ کر ہمارے دلوں میں کس قدر جوش پیدا ہوتا تھا کہ کاش کوئی ایسی ہی تحریک ہندوستان کی غریب اور بے شمار رعایا کو قرض کی مصیبت سے نجات دینے کے لئے جاری ہو خدا کا شکر ہے کہ ہماری وہ تمنا اب پوری ہو چلی ہے ریاست حیدرآباد نے حال ہی میں پنجاب گورنمنٹ سے ایک ایسے عہدہ دار کی خدمات مستعار لی ہیں جنہوں نے اس تحریک کو وہاں بہت کامیابی سے چلایا ہے۔ اور جب میں نے

ان سے یہ دریافت کیا کہ وہ پنجاب کی کوئی ایسی مثال بتا سکتے ہیں جیسی کہ راش ڈیل پانیرز کی تو انہوں نے مجھے ایک ایسی ہی حیرت انگیز مثال سنائی جسے میں آپ کو سنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مختصر یہ کہ ایک گاؤں میں جس کی آبادی ۵۰۰ کی ہے۔ اور جس میں صرف مسلمان ارائیین آباد ہیں ایک مجلس قائم کی گئی ان کی ساکھ ایسی کم ہوگئی تھی کہ کوئی ساہوکار انہیں قرض نہیں دیتا تھا اور وہ اس قدر مفلس تھے کہ قیام مجلس کے وقت گیارہ روپیہ سے زیادہ جمع نہ کر سکے لیکن آپ کو سن کر بے انتہا حیرت ہوگی کہ وہی مجلس جو ۱۹۰۶ء میں گیارہ روپیہ کے سرمایہ سے کھولی گئی تھی۔ ۱۹۰۹ء اس کا سرمایہ ۱۳۰۰۰ اور ۱۹۱۳ء تین لاکھ ہوگیا۔ کیا یہ ایک زندہ مثال ایسی نہیں ہے کہ جس کی تقلید کی جائے؟ میں مسلمانان جنوبی ہند سے اس تمام قوت کے ساتھ جو میرے امکان میں ہے درخواست کرتا ہوں کہ انہیں ایسے تجارتی مرکز میں جیسا کہ وانیم باڑی ہے ضرور اس تحریک کو فروغ دینا چاہیئے۔ اس مسئلہ کے ذکر کرنے اور زور دینے سے میرا منشا یہ ہے کہ مجالس امداد باہمی کے قیام سے لوگوں میں تعلیم کا شوق پیدا ہوگا اور تعلیم سے ان مجالس کو مدد ملے گی، ابتدائی تعلیم اور یہ مجالس ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔

تجارت و حرفت و صنعت

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ میں نے مجالس امداد باہمی کا خاص طور پر اس لئے یہاں ذکر کیا ہے کہ وانیم واڑی ایک تجارتی مرکز ہے اور اگرچہ وانیم واڑی اسلامیہ ہائی اسکول نے اپنے نصاب تعلیم میں کسی قدر اس کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن جب تک یہاں کے ہمدرد تجار اس مدرسہ کے طالب علموں کو عملی طور پر مدد نہ دیں گے محض کتابی تعلیم کام نہیں آسکتی۔ مجھے

یہاں کے دور اندیش اور عالی ظرف تاجروں سے پوری توقع ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنی فیاضی سے ایک اعلیٰ درجہ کا کامیاب ہائی اسکول قائم کردیا ہے اور جو یقین ہے کہ بہت جلد ان کی دریا دلی اور ہمت کی بدولت کالج کے درجہ کو پہنچ جائے گا وہ اپنے گردو پیش کے حالات کے لحاظ سے اپنی ملکی حرفت وصنعت وتجارت کو بھی فروغ دینے میں سعی فرمائیں گے اور اس کے لئے یہاں کے طالب علم سب سے بہتر ذریعہ ہیں۔ علمی ترقی کے ساتھ جب تک ہم مادّی ترقی کا پورا خیال نہ کریں گے ہم صحیح معنوں میں کبھی کامیاب قوم نہیں ہوسکتے اگر اس اسکول کی قابل قدر کوششوں کے ساتھ یہاں کے ہمارے دور تجربہ کار تاجروں کی عملی سعی بھی شامل حال رہی تو یہ ایک ایسا شاندار کام ہوگا کہ تمام ہندوستان میں وانیم واڑی کا نام عزت و فخر کے ساتھ لیا جائے گا۔ امید ہے کہ منتظمین اسکول اور تاجران شہر مل کر اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے ضرور کوئی صورت نکالیں گے کیوں کہ یہ اندیشہ عام طور پر بڑھتا جاتا ہے کہ تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کی تجارت اور حرفت وصنعت پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور ملک کے تعلیم یافتہ سرکاری ملازمتوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اگر حالت یہی رہی تو سمجھ لیجئے کہ اس سے بڑھ کر ملک کی اور کوئی بدقسمتی نہیں ہوسکتی۔

میں اس موقع پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کیوں کہ یہ ایسا معاملہ ہے کہ جس کا تعلق تمام ہندوستان اور ہندوستان کی تمام اقوام سے یکساں ہے۔ حال ہی میں ایک کمیشن ملک کی صنعت وحرفت وغیرہ کی تحقیقات کے لئے قائم ہوا ہے جو اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرے گا اور امید کی جاتی ہے کہ اس کے نتائج ملک کے حق میں مفید نکلیں گے۔

حضرات! ہندوستان میں ہم مسلمانوں کی حالت بہت نازک ہے۔ ایک طرف ہمارا تعلق حکومت سے ہے اور دوسرے طرف ہمسایہ اقوام سے۔

دنیا میں کوئی حکومت کامل اور بے عیب نہیں ہوتی، جہاں ہم اس کے فروگزاشتوں پر نظر ڈالتے ہیں وہاں ہمیں اس کے انصاف و امن جدید تعلیم و جدید خیالات کی اشاعت کا بھی ممنون ہونا چاہئے ہمیں اس کی قدر اس وقت معلوم ہوگی جب ہم اپنے تئیں اہل حکومت کی جگہ پر فرض کرکے غور کریں اور دیکھیں کہ اگر حکومت ہمارے ہاتھ میں ہوتی تو باوجود ان تمام مشکلات اور اختلافات کے جو قدم قدم پر حکومت کی سدراہ ہیں۔ ہم اس سے بہتر کارہائے نمایاں کر سکتے تھے جو برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان میں انجام دئے ہیں۔ کیا یہ حیرت انگیز اور عجیب غریب بات نہیں کہ مٹھی بھر آدمی ایک دوسرے دنیا سے آکر ایک ایسے ملک میں حکمران ہیں جس میں مذاہب کا اختلاف زبانوں کا اختلاف، موسموں کا اختلاف تمدن کا اختلاف اور ایسے ہی بے شمار اختلافات ہیں۔ ان مشکلات و اختلافات کے کم کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ گورنمنٹ ہم پر اور ہم گورنمنٹ پر اعتبار کریں ایک دوسرے کے معاون اور یار و مددگار رہیں۔ کیوں کہ اعتبار سے اعتبار اور بے اعتباری سے بے اعتباری پیدا ہوتی ہے مسلمانوں نے گذشتہ زمانہ میں اور اس سے بڑھ کر حال کے زمانہ میں اپنی دوستی اور وفاداری کا پورا حق ادا کیا ہے اور باوجود ان غیر متوقع تغیرات کے جن کی صراحت کی یہاں ضرورت نہیں مسلمانان ہند کی حالت بہت نازک ہوگئی تھی مگر وہ مطلق نہیں ڈگمگائے اور اپنی دوستی اور وفاداری میں ثابت قدم رہے ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ اس اعتبار اور وفاداری کی داد ہمیں ضرور ملے گی اور جنگ کے بعد اہل ہند کو ضرور ایسے حقوق عطا ہوں گے جو ہماری تعلیم و ترقی اور رفاغت و مرفہ الحالی کا موجب ہوں گے۔

لیکن حکومت کی کامیابی اور ملک کی خوش نصیبی اس میں ہے کہ ہم اور ہمارے ہندو بھائی آپس میں خلوص و محبت سے رہیں اور ان چھوٹی چھوٹی اور بے حقیقت باتوں پر

لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں جو ہم دونوں کے لئے باعثِ ننگ ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم جو ایک خاک سے پیدا ہوئے ایک آب و ہوا میں پلے اور ایک مادرِ ہند کے فرزند ہیں آپس میں لڑیں جھگڑیں حسد و نفاق رکھیں اور پھر زندہ و خوش حال رہ سکیں؟ ہماری ترقی ہماری خوش حالی نہیں بلکہ ہماری زندگی اور اس ملک کی نجات ہمارے اتفاق و اتحاد میں ہے لیکن یہ امر ہم سب کی مسرت کا باعث ہے کہ صوبہ مدراس ان تنگ خیالیوں اور ان حاسدانہ رقابتوں سے پاک ہے۔ ہندو مسلمانوں کے تعلقات یہاں زیادہ دوستانہ اور مخلصانہ ہیں اور یہ ہم سب کے لئے بہت مبارک فال ہے اور عجب نہیں کہ اسی اتحاد کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہ نسبت دوسروں صوبوں کے یہاں زیادہ بہتر ہے

مگر حضرات ان مقاصد کا حصول صرف ایک چیز پر منحصر ہے۔ وہ تعلیم اور صحیح طریقہ تعلیم ہے۔ جہالت کے معنے اب صرف بے علمی ہی کے نہیں بلکہ اس میں بد اخلاقی رذالت افلاس اور بے ہمیتی کے معنی بھی پنہاں ہیں۔ آؤ ہم سب اس بات کا بیڑا اٹھائیں کہ جس طرح بنے ہم جہالت کا زور توڑیں، ملک کے گوشہ گوشہ میں علم و ایمان کا نور پھیلائیں۔ اور اس کمال انسانیت و ترقی تک پہنچ کے رہیں۔ جس کی تمنا مادرِ ہند کے ہر سچے فرزند میں موج زن ہے۔

خطبۂ صدارت

اکتیسواں اجلاس آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

منعقدہ ۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۱۷ عیسوی

کلکتہ

حضرات! مجھے کم و بیش ایک چوتھائی صدی سے اپنی بساط کے موافق تعلیمی معاملات سے خاص دلچسپی اور شوق رہا ہے اور اس مدت میں میں نے تعلیم کی مختلف تحریکات اور مدارج پر کچھ نہ کچھ غور کیا ہے۔ نیز اپنے فرائض منصبی کے لحاظ سے بھی میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست میں ترویج ترقی تعلیم پر مامور ہوں مجھے اس عرصہ میں مختلف حیثیتوں سے یہ ثابت ہوگیا ہے اور میرے دل پر اس کا گہرا نقش ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی ترقی و فلاح کا دار و مدار صرف تعلیم پر ہے اور ملک کی سب سے بڑی خدمت جہالت کے مٹانے اور اشاعت و حمایت تعلیم میں ہے۔ اس لئے میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مسرت اور اس سے زیادہ کوئی فخر نہیں ہوسکتا کہ میں اس معزز کانفرنس کا (جو مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی تعلیمی جماعت ہے) صدر انتخاب کیا جاؤں۔ میں آپ کا دلی احسان مندی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس عزت کے قابل سمجھا۔ میں اپنی زندگی کے اِس دن کو ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ یاد کروں گا۔ لیکن جب میں اس کام کی اہمیت اور ذمہ داریوں کو دیکھتا ہوں اور اُن قابل اور فاضل حضرات کی فہرست پر نظر ڈالتا ہوں جو اس سے قبل اس کرسی صدارت کو زینت دے چکے ہیں تو اپنے آپ کو اس جگہ پر دیکھ کر اپنے دل میں محجوب ہوتا ہوں

اور سمجھتا ہوں کہ اس سلسلۂ زرّیں میں شاید سب سے کمزور کڑی میں ہی ہوں۔ مجھے اپنے ضعف کا اعتراف ہے۔ اور اگر میں اس خدمت کو کامل طور پر انجام نہ دے سکوں جو آپ نے میرے سپرد کی ہے اور مجھ سے وہ توقعات پوری نہ ہوں جو آپ نے خیال کر رکھی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تنگی وقت کا عذر آپ کی نظرِ کرم اور میرا دلی خلوص اس قصور کی تلافی کر دیں گے۔

حضرات! یہ زمانہ نفسانی کارستانیوں کا سب سے بڑا مظہر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاک کا پتلا ہوا و ہوس کے جنون میں سارے عالم کو تہ و بالا کر دینے میں دریغ نہیں کرے گا۔ اسی نفسانیت کی بدولت آج تمام دنیا میں سیاسی، اخلاقی اور اقتصادی تہلکہ مچا ہوا ہے۔ اور کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جہاں اس مصیبت کا رونا اور جہاں اس آفت کا ماتم نہیں ہے۔ اور باوجود تین سال گزرنے کے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا کیا نتیجہ ہو گا؟ کوئی نہیں بتا سکتا کہ مشیتِ ایزدی کیا ہے؟ اور اس تاریکی کے پیچھے جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے کیا پنہاں ہے؟ لیکن ایک امید ہے کہ جس پر ہم قائم ہیں اور جو حاکم و محکوم اور راجا اور پرجا دونوں کے دلوں میں یکساں موج زن ہے جس طرح طوفان کے بعد سکون اور تاریکی کے بعد روشنی کا ہونا یقینی ہے۔ اسی طرح اس سیاسی اور اقتصادی ہیجان کے بعد ایک اطمینان کا زمانہ آنے والا ہے جو انسانی ترقی کا جدید دور ہو گا اور جس کا سب سے ممتاز جزو تعلیم کی نئی تحریک ہو گی۔

یادِ رفتگان! قطع نظر اس عالم گیر مصیبت کے ہم جب اپنے ملک پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ سال ہمارے لئے کچھ کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ افسوس کہ ہم میں سے چند ایسے بزرگ اٹھ گئے کہ جن کی رہنمائی، جن کا علم و فضل اور جن کی نیک نفسی ہمارے لئے

باعثِ فخر اور موجبِ تسکین تھی۔ سب سے اوّل میں اُس بزرگ قوم کا ذکر کرتا ہوں جو ہندوستان کا سچا فدائی تھا۔ اس کی زندگی پاک اور سادہ تھی۔ اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہی سے اُس نے اپنی ساری زندگی ملک کی خدمت میں بسر کر دی۔ میں اس چھوٹے قد کے گورے چٹے بزرگ کو جو اکثر سرُخ ریشمی پائجامہ پہنے رہتا تھا لڑکپن سے جانتا تھا اور جب ہم مدرسہ جاتے اور وہ کہیں راستہ میں نظر آجاتا تو آپس میں کہتے تھے کہ "وہ دادا بھائی ماسٹر جا رہا ہے"۔ اس نے اپنی زندگی مدرّسی سے شروع کی اور یہی نہیں کہ اس نے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم میں کوشش کی یا وہ کالج میں پروفیسر تھا بلکہ وہ ہمارا حقیقی معلم تھا اور آخر دم تک ہمارا معلم رہا۔ اس زمانہ میں حبِّ وطن کا سبق اُس نے ہمیں سکھایا۔ اس کی ساری زندگی ابتدا سے آخر تک ابنائے وطن کے لیے سبق آموز ہے ہندوستان اُس کا اوڑھنا بچھونا اور اس کی ترقی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ جدید ہندوستان کے بنانے میں سب سے زیادہ اسی محترم بزرگ نے حصّہ لیا۔ اور جب ہندوستان کے دورِ جدید کی تاریخ لکھی جائے گی تو دادا بھائی نوروزجی کا نام سب سے اوّل آئے گا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ میرا دل بھر آتا ہے جب کبھی میں اپنے دوست مولانا سیّد کرامت حسین مرحوم کا ذکرِ خیر کرتا ہوں۔ ان کا علم و فضل اور تبحرّ، اُن کی پاک صاف اور سادہ زندگی، ان کا ایثار، اُن کی صداقت یہ ایسی خوبیاں ہیں کہ ہمیں اپنی قوم میں ڈھونڈھے نہیں ملتیں۔ وہ اپنے خیال میں نہایت پختہ اور اپنی دُھن کے پکے تھے۔ انہوں نے درویشانہ زندگی بسر کی اور اپنا تمام اثاثہ تعلیم نسواں کے نذر کر دیا جس کے وہ ہمیشہ سے بڑے حامی اور دل دادہ تھے۔ وہ اپنے علم و فضل ہی میں نہیں بلکہ اخلاقی خوبیوں میں

بھی جامع کمالات مشرق و مغرب تھے۔ میں نے اُن کی صحبت سے بہت کچھ فیض حاصل کیا اور میرے دل میں اُن کی اس قدر وقعت ہے کہ میں نہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ افسوس کہ اُن کی وفات سے ہماری قوم میں ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے کہ اب اس کا پُر ہونا دشوار نظر آتا ہے۔

پرنسپل ورڈس ورتھ کے نام سے ہندوستان کے دُوسرے صوبوں کے لوگ اس قدر واقف نہیں۔ جس قدر اہل بمبئی اور وہاں بھی اب نوجوان تعلیم یافتہ غالبًا پرنسپل موصوف کے حالات سے زیادہ تر واقف نہ ہوں گے۔ اس نے اپنے علم و فضل اور اپنے اعلیٰ خیالات کا یہاں کے تعلیم یافتہ طبقے پر اور ان کے ذریعہ سے تمام مُلک پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا مسٹر تلنگ اور مسٹر گوکھلے جیسے نامور بزرگ یا وہ سرگرم نوجوان لوگ جو جمشید جی ٹاٹا کمپنی کے دست و بازو اور دل و دماغ ہیں، اسی کی تعلیم کے خوشہ چین ہیں، پرنسپل ورڈس ورتھ نے اپنے فرائض بہ حیثیت ایک تعلیمی افسر کے محدود نہیں کر رکھے تھے بلکہ اس نے ملک کی تمام اہم تحریکات میں اپنی قلم اور زبان سے ہمیشہ مدد دی۔ وہ درحقیقت ہندوستان کا ہمدرد اور ہماری ترقی کا خواہاں تھا۔ اس شخص کے ملنے سے انگریزی قوم کی وقعت دل میں پیدا ہوتی تھی۔ یہی وہ نیک باطن، ہمدرد اور روشن خیال انگریز ہیں جو انگریزوں کے لئے باعثِ فخر ہیں اور جنہوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں رشتۂ اتحاد و مودت کو مستحکم کیا اور ہمارے دلوں پر اپنی خوبیوں کا گہرا نقش چھوڑا۔ اگر سررشتۂ تعلیم میں ایسے ہی فاضل مخلص اور ہمدرد انگریز آتے رہتے۔ اور نوجوان طلبہ کو ایسے شریف النفس انگریزوں سے سابقہ پڑتا رہتا تو شاید ہندوستان کی موجودہ نسل پر بدنامی کا وہ داغ نہ لگتا۔ جس سے ہمیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور جس قدر جلد ممکن ہو ہمیں اُس کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہئیے پرنسپل ورڈس ورتھ کی وفات سے ہمارا ایک محسن دنیا سے اُٹھ گیا اور ہمیں اس پر حقیقی رنج

و افسوس ہے۔

تحقیق واقعات کی ضرورت

حضرات! مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل پر بحث کرتے وقت سب سے بڑی مشکل میں نے
یہ محسوس کی کہ اس بارے میں صحیح اور مکمل اعداد وشمار و واقعات ایسے موجود نہیں جن سے ضروری
مدد مل سکے افسوس ہے کہ کانفرنس کی طرف سے مجھے ایسے تنگ وقت میں اطلاع ملی کہ میں یہ تمام اعداد
وشمار فراہم نہ کر سکا۔ ورنہ میں اس بات کے دکھانے کی کوشش کرتا کہ اولاً مختلف صوبوں کے مسلمانوں
نے تعلیم کے مختلف مدارج اور شعبوں میں کہاں تک ترقی کی ہے۔ دوم دوسرے اقوام کے مقابلے
میں ان کی رفتارِ ترقی کیا رہی ہے؟ اور ان میں اور دوسرے اقوام میں جہالت نے جو تفاوت پیدا
کر رکھا ہے وہ کم ہو رہا ہے یا زیادہ؟ یا اسی قدر ہے جو پہلے تھا؟ کیا وہ فی الحقیقت میدانِ تعلیم
میں دوسرے اقوام سے قریب ہوتے جاتے ہیں تاکہ اپنے عزیز وطن کے معاملات و مسائل کے
طے کرنے میں برابری کے دعوے سے شریک ہو سکیں؟ مجھے اس کے متعلق زیادہ زور دینے
اور تاکید کرنے کی ضرورت نہیں کہ جب تک کانفرنس کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس قسم کے صحیح اور مکمل
اعداد وشمار اور واقعات شائع نہ ہوتے رہیں گے اس وقت تک ہم صحیح طور سے یہ نہیں معلوم
کر سکتے کہ ہماری حالت کیا ہے اور کون سے ایسے مسائل ہیں جن پر ہمیں فوری توجہ کرنی چاہیے
اور کونسی ایسی تجویزیں ہیں جو ہمارے مرض کی دوا ہو سکتی ہیں اور کونسی ایسی تدبیریں ہیں جو ہمیں
منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہیں۔ کانفرنس کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے ہر شعبے، ہر پہلو
اور تمام جزئی اور تفصیلی امور کے اعداد وشمار اور واقعات کمال احتیاط و صحت، صبر اور دقت نظر کے
ساتھ مہیا کرتی رہے۔ بلکہ مناسب ہوگا کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو اسی کام پر لگائے جائیں اور
ہر شخص خاص خاص مسئلے کو لے لے اور اپنا تمام وقت اسی پر صرف کرے اور یہ تحقیقاتیں ملک میں

عام طور پر شائع ہوتی رہیں۔ کانفرنس کو اس فرض کے ادا کرنے میں اب کچھ عذر نہیں ہو سکتا جب کہ فخر روسا ہند اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی شاہانہ امداد نے اسے مالی حالت کی طرف سے بے نیاز کر دیا ہے۔

مسلمان اور اردو

مختلف صوبوں کی تعلیمی اور مردم شماری کی رپورٹوں کے پڑھنے اور عام حالات و واقعات کے دیکھنے سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی اشاعت اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں ایک خاص مناسبت ہے جن جن مقامات میں اردو زیادہ رائج اور شایع ہے اسی قدر وہاں کے مسلمان زیادہ تعلیم یافتہ زیادہ شایستہ اور ترقی یافتہ نظر آتے ہیں اور قومی اور ملکی معاملات میں زیادہ سرگرم اور مستعد معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح جس نسبت سے اردو مختلف مقامات میں داخل ہوتی جاتی ہے اسی نسبت سے وہاں کے مسلمانوں کا وجود ٹوٹتا جاتا اور ان میں وسعتِ نظر اور احساس قومی پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ واقعہ بہت قابل غور ہے اور چونکہ اس سے مسلمانوں کی تعلیم و ترقی وابستہ ہے اس لئے میں کسی طرح اسے نظر انداز نہیں کر سکتا اور نہ سرسری بحث پر اکتفا کر سکتا ہوں۔

اگر ہم ہندوستان کے مختلف صوبوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اگرچہ اردو زبان کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن مختلف مقامات پر اس کی حیثیت مختلف ہے۔ اول وہ مقامات ہیں جہاں کی مادری زبان اردو ہے۔ وہاں کسی قسم کی دقت نہیں دوسرے وہ مقامات جہاں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے اور تحتانیہ مدارس میں ان کی تعلیمی زبان اردو ہے۔ مثلاً صوبۂ پنجاب جہاں مسلمانوں نے اس زبان کو اختیار کر لیا ہے۔ اور مثل مادری زبان کے ہو گئی ہے اور سرکاری دفاتر میں بھی یہی زبان استعمال ہوتی ہے یہاں بھی کوئی دشواری نہیں لیکن اصل دشواری

وہاں پیش آتی ہے۔ جہاں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے اور اردو ان مقامات میں عام زبان نہیں مثلاً بمبئی اور مدراس میں ان مقامات میں بھی ایسے مسلمان موجود ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور خواہ وہ کیسی ہی غیر فصیح کیوں نہ ہو وہ کسی حالت میں اسے ترک کرنا گوارا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مقامی طور پر اردو کا نام یہاں ہندوستانی یا مسلمانی ہے اور اس سے اس تعلق کا پتہ لگتا ہے جو مسلمانوں کو اس زبان سے پیدا ہو گیا ہے۔ ایسے مقامات پر اردو کا مسئلہ کسی قدر پیچیدہ ہو جاتا ہے جب ہم ان مقامات پر نظر ڈالتے ہیں جہاں مسلمانوں کی وہی زبان ہے جو ان کے ہندو بھائیوں کی تو یہ پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ دشواری اور پیچیدگی وہاں پیش آتی ہے جہاں کی زبان دراودی ہے۔ مرہٹی گجراتی زبانیں اردو سے اقرب ہیں کیوں کہ آریائی ہونے کے لحاظ سے ان کی اصل ایک ہے لیکن دراودی زبانوں کو ترکیب و ساخت اور اصلیت کے لحاظ سے اردو سے کوئی تعلق نہیں۔

جب ہم ہندوستان کے مختلف صوبوں کی تعلیمی رپورٹوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوتی ہے کہ خواہ ان مقامات کی اردو زبان کے لحاظ سے کچھ ہی حیثیت ہو لیکن مسلمان یکساں طور پر اس بات کے خواہشمند ہیں بلکہ ان کا اصرار ہے کہ ان کے بچوں کے لئے کسی نہ کسی شکل میں اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کیوں کہ اس سرزمین مقدس کی دوسری اقوام کی طرح مسلمانوں کو بھی اپنا مذہب جان سے زیادہ عزیز ہے اور اسلامی تاریخ، اسلامی مذہب و اخلاق کا سرمایہ جس قدر اردو میں ہے ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں کے بچے ہر جگہ ابتدا میں قرآن شریف پڑھتے ہیں اور اس کی اور اردو کی تحریر اور اسلامی مذہب و اخلاق کی اکثر اور

مستند کتابیں اردو میں ہیں اس لئے مذہبی اور اردو زبان کی تعلیم باہم اس طرح وابستہ ہوگئی ہیں کہ ان کا جدا کرنا ممکن نہیں اور اس لئے اردو کی تعلیم کے مطالبہ کا پورا کرنا قوم اور گورنمنٹ کا دونوں کا فرض ہے لیکن یہ خیال رہے کہ میرا مطلب اس انتظام سے یہ نہیں ہے کہ ہر جگہ اردو ذریعہ تعلیم قرار دی جائے بلکہ اس کا فیصلہ مقامی حالات پر منحصر ہے خواہ اردو کی تعلیم بہ حیثیت زبان اوّل کے ہو یا زبان دوم کے مگر مسلمان طلبہ کے لئے اس کا انتظام ہونا نہایت ضروری ہے۔

صوبہ برہما کی تعلیمی رپورٹ میں مفصلۂ ذیل الفاظ قابل غور ہیں اور یہ میرے ان خیالات کی تائید کرتے ہیں جن پر میں اس وقت بحث کر رہا ہوں۔

"دونوں زبانوں (یعنے اردو اور برہمی) کی تعلیم دیجا سکتی ہے لیکن کونسی زبان اوّل ہو اس کا فیصلہ بالکل مقامی حالات پر منحصر ہے بعض مدارس نے اس پر عمل شروع کر دیا ہے۔ اپر برہما خصوصاً یا کسی اور یا مے تھن اضلاع میں برمی مسلمان آباد ہیں جن میں سے اکثر سابق شاہان برہما کے ہندوستانی سپاہیوں کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے بچے برہمی ورنکلر مدارس کا معمولی نصاب پڑھتے ہیں لیکن اردو اس قدر ضرور سیکھتے ہیں جو ان کی دینی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ یہ مدارس برہمی ڈپٹی انسپکٹروں کی نگرانی میں ہیں۔ رنگون میں ہندوستانی مسلمان ہیں جو برہمی زبان بطور مادری زبان کے اور اردو بطور دوسری زبان کے پڑھتے ہیں اسلامی مدارس اور اردو مدارس میں برہمی مسلمانوں اور اردو بولنے والے مسلمانوں میں امتیاز نہ کرنے سے یہ کچھ غلط فہمی واقع ہوگئی ہے۔ کیرن قوم کو کبھی دو زبانوں کا مسئلہ ناقابل حل محسوس نہ ہوا۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان ان مشکلات کو رفع نہ کر سکیں جو ان کی تعلیمی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

یہاں یہ اعتراض کیا جائے گا اور میں نے بعض صاحبوں کو یہ اعتراض کرتے سنا ہے کہ

اگر مسلمان طلبہ کے لئے اردو کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علاوہ مقامی زبان کے جس کا سیکھنا مقامی ضروریات و تعلقات کے لحاظ سے ضروری ہے۔ مسلمان طالب علموں پر ایک اور زبان کے سیکھنے کا بار بڑھ جائے گا۔ بیشک یہ صحیح ہے اور یہ بار مسلمانوں کو اٹھانا پڑے گا اور اس کے اٹھانے کے لئے وہ خوشی سے آمادہ ہیں۔ کیوں کہ وہ اردو کو قومی زبان سمجھتے ہیں اور تہذیبِ ذوق، اسلامی تمدن، اور اتحادِ خیال و یک جہتی کے لئے اس کا سیکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ دنیا میں جو قومیں قلیل تعداد میں ہوتی ہیں انہیں بہت کچھ خسارہ اٹھانا پڑتا ہے اور تھوڑی بہت قربانی کرنی پڑتی ہے اگر ہمیں اپنی ہستی قائم رکھنا ہے تو ہمیں بھی اس خسارہ اور قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیئے اور اگر مقامی لحاظ سے جزئی نقصانات بھی ہوں تو انہیں برداشت کرنا چاہیئے ورنہ مسلمانوں کی قلیل جماعتیں جو مختلف صوبوں اور مقاموں میں منتشر پائی جاتی ہیں وہ اسلامی تمدن و تہذیب اور اسلامی اخلاق و مذہب سے محروم رہ جائیں گی اور ان کی حالت اس قدر ذلیل و پس ماندہ ہو جائیگی کہ ان میں اور نیچ قوموں میں کچھ فرق نہ رہے گا یا وہ گمنام و بے نشان ہو کر دنیا سے مٹ جائیں گی۔ ایک زمانہ تھا جب کہ یہ ممکن تھا کہ یہ زبان جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی یادگار اور پراکرت، فارسی، اور عربی کی گودوں میں پلی ہے ہندو مسلمانوں اور انگریزوں کی سعی اور ہمدردی سے جنہوں نے اس کی نشو و نما میں برابر کا حصہ لیا تھا، اس سرزمین کی مشترکہ اور عام زبان ہو جاتی، جو قومی ارتقا اور باہمی اتحاد و یک جہتی میں بہت بڑی سہولت پیدا کر دیتی۔ لیکن اگر ایسا ہو جاتا اور ایسا ہونا دشوار نہ تھا تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ انگریزی حکومت اور دانشمندی کی دائمی یادگار رہتی لیکن افسوس کہ آپس کے حسد و رقابت نے ملک کو اس نعمت سے محروم کر دیا۔ وہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور اب یہ صرف خواب

خیال رہ گیا ہے۔ اس کی جگہ اب ایک اور زبان نے لے لی ہے جو سات سمندر پار سے آئی ہے۔

عمل و خدمت

لیکن کیا اس عظیم الشان کانفرنس میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے؟ کیا ہم مسلمانوں کی اس خواہش اور مطالبہ کو سن کر اور سمجھ کر خاموش رہ جائیں گے؟ کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہوسکتی کہ ہم اُن کی اس دلی خواہش اور مطالبہ کو پورا کرسکیں؟ اس کی تدبیر عمل اور خدمت ہے اور ایسے بڑے کام مستقل عمل اور خدمت ہی سے انجام پاسکتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر صوبہ میں مسلمانوں کے سینکڑوں اور ہزاروں مکتب موجود ہیں جہاں قرآن شریف اور اُردو کی بری بھلی تعلیم ہوتی ہے۔ اگر ہم اُن کی ابتدائی تعلیم کے لئے غور و احتیاط کے ساتھ ایک مناسب نصاب تعلیم مقرر کردیں تو یہی مکتب ہمارے مقاصد کے لئے نہایت مفید و کارآمد ہوسکتے ہیں۔ کانفرنس کا یہ فرض ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے کام کرنے والوں کی ایک جماعت قائم کرے۔ ایسی جماعت نہیں جو کبھی کبھی ہندوستان کے کسی تعلیمی مرکز میں یا صوبہ کے بڑے شہر میں اپنے جلسے منعقد کرے۔ بلکہ ایسے کام کرنے والے اشخاص جو ہر قصبے اور گاؤں میں موجود ہوں جو مسلمانوں کی مقامی ضروریات کا صحیح طور سے مطالعہ کریں اور اپنے مشورہ اور اتحاد سے اُن کی مشکلات کے آسان کرنے میں مدد دیں اور اگر ضرورت ہو تو مجاہدہ کے لئے بھی آمادہ رہیں جب تک مستعد، مخلص اور خاموشی سے کام کرنے والے افراد ملک کے گوشہ گوشہ میں نہ پھیل جائیں گے اس وقت تک ہماری عمدہ سے عمدہ تجویزیں اور رزولیوشن فصیح سے فصیح تقریریں اور پُرزور سے پُرزور درخواستیں اور میموریل بیکار ثابت ہوں گے اور ہم کبھی جہالت کی تاریکی رفع کرنے میں کامیاب نہ ہوں گے۔ ایسے افراد کے مہیا کرنے

میں جو خوشی اور دیانت کے ساتھ کام کرنے پر رضا مند ہوں محنت، صبر اور استقلال کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اس کانفرنس کی صوبہ واری اور ضلع واری مجلسوں کو چاہیئے کہ یہ کام فوراً اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ جو لوگ اس مبارک جماعت میں شریک ہوں گے وہ اپنی قوم پر بڑا احسان کریں گے۔ اور اس کا اجر بھی انہیں فوراً مل جائے گا۔ کیونکہ اس خدمت کو اپنے ذمہ لے لینے سے انہیں اپنے پیشہ اور کاروبار میونسپلٹیوں کے معاملات اور زندگی کے عام مسائل میں بڑی مدد ملے گی۔ اب باتیں اور تقریریں کرنے کا وقت نہیں ہے ہندوستان کی آئندہ قسمت کا فیصلہ سچائی سے عمل کرنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ جماعت کمر ہمت باندھ کر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کردے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حالت ہوگی کہ کوئی مسلمان بچہ ایسا نہ ملے گا جو کم سے کم ایک زبان میں لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔

دیسی زبانوں کی یونیورسٹیاں

عثمانیہ یونیورسٹی

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اُردو زبان کی وسعت صرف ابتدائی تعلیم تک محدود رہے گی؟ کیا اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے؟ کیا وہ زبان جسے ہم نے زمانہ معصومیت میں شوق سے پڑھا تھا ابتدائی تعلیم کے بعد ہمارا ساتھ چھوڑ دے گی؟ کیا وہ زبان جس کے ذریعے سے ہم نے اپنے مقدس مذہب و اخلاق کی تعلیم حاصل کی تھی، آگے چل کر ہمارے کام نہیں آئے گی؟ کوئی خوددار قوم اس بات کو گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کی مادری یا قومی زبان عمر بھر اس کا ساتھ نہ دے، یا وہ لطیف اور اعلیٰ خیالات کے اظہار میں قاصر ہو یا وہ

علمی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے شرماتی ہو اگر کوئی ایسی زبان ہے تو بلا شبہ وہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے گی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اردو زبان میں آگے بڑھنے' اعلیٰ، لطیف اور علمی خیالات کے اظہار کی کافی صلاحیت موجود ہے۔ بشرطیکہ ہم میں خودداری اور غیرت ہو۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ ہندوستان کی اُن تمام آریائی اور دراوڑی زبانوں میں جن کے شیدائی لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ہیں یہ صلاحیت موجود ہے۔ بشرطیکہ اہل زبان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو۔ اس بنا پر میں صرف ان تمام حضرات سے جو اس کانفرنس میں تشریف رکھتے ہیں، نہ صرف اُن سے جن کی مادری زبان اردو ہے بلکہ ہر مذہب و ملت کے اصحاب سے خواہ ان کی کوئی زبان ہو، یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مبارک اور عظیم الشان تحریک کا جس کی بنیاد فرماں روائے دکن اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ' نے قائم کی ہے۔ سچے دل اور جوش کے ساتھ خیر مقدم کریں۔ کیوں کہ یہ صحیح معنوں میں قومی تعلیم کی بنیاد ہے۔ اس تحریک سے میرا مطلب عثمانیہ یونیورسٹی سے ہے جو حضور پر نور کے فرمان سے حیدرآباد میں قائم کی گئی ہے جس میں انگریزی زبان کی تعلیم بحیثیت زبان کے لازمی ہوگی لیکن تمام علوم و فنون یونیورسٹی کے اعلیٰ مدارج تک اردو زبان کے ذریعہ پڑھائے جائیں گے یہ نیا اور نادر تجربہ ہے اگر اس میں ہمیں کامیابی ہوئی اور ثابت ہوا کہ ہمارے طالب علم غیر زبان کے الفاظ کے رٹنے سے آزاد ہو گئے ہیں اور بجائے اس کے ان کا میلان اشیاء کے حقیقی علم حاصل کرنے کی طرف ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان میں انگریزی زبان کی قابلیت بھی کافی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔ تو اس تجربہ سے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لئے بھی دروازہ کھل جائے گا۔ اور اسی کے ذریعہ سے وہ گوہر نایاب جس کی جستجو میں ہم حیران و سرگردان ہیں۔ یعنے قومی تعلیم وہ بھی ہمیں مل جائے گا۔ یہی وہ تعلیم ہے جو

ہماری قومی خصوصیات و روایات اور ملکی حالات پر مبنی ہے۔ جسے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اجنبی اور غیر نہیں بلکہ اپنی چیز ہے جو ہمیں تعلیم کی کسی منزل میں بھی اپنی تہذیب و شائستگی اپنی خصوصیات اور اپنے مذہب و اخلاق سے بیگانہ نہیں بناتی بلکہ ان کی تکمیل میں مدد دیتی ہے پھر آپ اُن علوم و فنون اور اعلیٰ خیالات کا خیال کیجئے جن سے ہماری زبان مالا مال ہو گی اور جن تک ہر فرد قوم کی رسائی ہو سکے گی میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ عام تعلیم صرف معمولی شُد بُد تک محدود رہنی چاہیئے اور جس سے آگے بڑھنے کا دعوئے مفت اور جبری تعلیم کو بھی نہیں ہے بلکہ علم کی نعمت سے ہر شخص کو متمتع ہونے کا حق حاصل ہونا چاہئے اور ابتدائی درجہ سے لے کر آخری منزل تک طے کرنے کا موقع ملنا چاہیئے تاکہ اس کی روشنی محلوں سے لے کر جھونپڑوں تک یکساں پہنچے یہ خدمت صرف اسی قسم کی یونیورسٹی انجام دے سکتی ہے جس کا سرچشمۂ فیض ہر کہ و مہ کے لئے ہر وقت اُبلتا رہے گا۔

فرقہ واری یونیورسٹیاں

حضرات! میں آپ سے سچے دل سے اور نہایت زور کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ آپ ایک لحظہ کے لئے بھی یہ گمان نہ کریں کہ اس قسم کی تحریک کسی طرح بھی کسی خاص فرقہ یا صوبہ یا جماعت سے مخصوص ہے اور اس کا منشاء آپس میں تفرقہ پیدا کرنا ہے بلکہ یہ قومی خود داری کا پہلا اصول ہے اور ہر قوم جس میں ذرا بھی غیرت ہے اپنے روایات تہذیب کے ادب و احترام پر مجبور ہے اور یہ ادب و احترام قومی ارتقا کا مخالف نہیں بلکہ اس کا بڑا حامی اور معاون ہے۔ انگلستان کے سب سے نامور سیاسی فلاسفر ایڈمنڈ برک نے جس کی تصانیف بدقسمتی سے اب ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم سے خارج کر دی گئی ہیں۔

کیا خوب کہا ہے :-

"کسی جتھے یا گروہ کی فلاح میں انہماک ظاہر کرنا، سوسائٹی کی کسی جماعت سے جس سے ہمارا تعلق ہے محبت کرنا جمہور کی محبت کا بیج بونا ہے۔ یہ اُس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس کے سہارے ہم ملک اور بنی نوع انسان کی طرف بڑھتے ہیں۔ سوسائٹی کی اس جماعت کی فلاح ایک امانت ہے جس میں سوائے بُرے لوگوں کے کوئی خیانت نہیں کرسکتا اور سوائے غدّار کے کوئی اُسے اپنے ذاتی اغراض کے لئے قربان نہ کرے گا۔"

میں اس قسم کی تمام تحریکات کو بشرطیکہ وہ باہمی نفرت اور حسد و رقابت سے پاک ہوں قومی حیات کی تکمیل کے لئے نہایت مبارک خیال کرتا ہوں۔ مجھے اس امر کی یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس وقت پہلے پہل اس کانفرنس میں مسلم یونیورسٹی کی بحث چھڑی تو مجھے سخت اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اُس تفریق و نفرت کو جو پہلے ہی سے اس بدنصیب ملک کی اقوام میں موجود ہے اور مشتعل کرے اور اس لئے میں فرقہ واری یونیورسٹیوں کے قیام سے ایک مدت تک بدگمان رہا۔ لیکن جدید حالات اور جدید انقلاب خیالات نے میرے دل میں کچھ کچھ امید پیدا کی ہے کہ ہندو مسلم یونیورسٹیاں اتحاد و محبت پیش نظر رکھ کر کام کریں گی۔ اور اُن میں سے ہر ایک یونیورسٹی اپنی اپنی تہذیب و علم اور تاریخی روایات کی خوبیوں کی تحصیل و تکمیل کرے گی۔ ایک دوسرے کے تمدن و علوم اور کمالات پر ہمدردانہ نظر ڈالے گی۔ اس طریقے سے ہندوستان کی ہر جماعت اور ہر قوم کو اپنی خصوصیات اور اپنے اصلِ تمدن کے لحاظ سے بڑھنے اور ترقی کرنے کی کامل آزادی ہوگی۔ تاکہ ہم اصلی ہندی قومیت میں اپنے مخصوص تمدنوں کے شائستہ نمونے پیش کرسکیں اور ہند کی قومی مجلس میں اپنی اپنی خوبیوں سے ایک دوسرے کی کوتاہیوں کی تلافی کریں جس طرح اسلامی تمدن نے مختلف صورتوں سے

ہندوستان پر اثر ڈالا ہے اور ہندوستان کے تمدن کا اثر مسلمانوں پر ہوا۔ اسی طرح ہم ہندو ہوں یا بدھوی ایرانی ہوں یا مسلمان یا عیسائی اپنی خصوصیات سے جواب تک ہم میں باقی ہیں ایک دوسرے پر پسندیدہ اثر ڈالتے رہیں گے۔ جس طرح مختلف ندیاں مختلف راستوں سے ہوکر آخر ایک دریا میں آکر ملتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے مختلف تمدن اور تہذیبیں مختلف طریقوں سے ترتیب پاکر ایک جگہ جمع ہوں گی۔ اور اس اصل ہندی قومیت اور اتحاد کی بنیاد ڈالیں گی جو ہماری تمام جدوجہد کی اصل غایت اور ہماری آئندہ ترقی اور کامیابی کا راز ہے ہمارے پیچھے قدیم ہندو، ایرانی اور اسلامی شاندار اور پُراسرار تہذیب وعلوم ہیں اور سامنے یورپین وسیع اور حیرت انگیز تمدن وسائنس۔ ہم نہ گزشتہ کو ترک کرسکتے ہیں اور نہ موجودہ سے انکار۔ انسانی ذہانت اور دماغ کے یہ دونوں مظاہر ہیں اور مشیت ایزدی ہے کہ ہم دونوں کی خوبیوں سے اپنے حیات اور علم ادب میں استفادہ کریں اس مقدس فرض کو یہی یونیورسٹیاں انجام دیں گی جو اپنے طالب علموں کے دلوں میں تہذیب، ذوق، علم کا سچا شوق، رواداری اور حب وطن کے ایسے بیج بوئیں گی کہ ہندوستان حقیقی معنوں میں جنت نشان ہوجائے گا اگرچہ یونیورسٹیاں الگ الگ ہیں۔ ان کے انتظامات بھی جدا جدا ہیں لیکن ان کے مقصد اور نصب العین میں کوئی فرق نہیں گو راہیں جدا جدا ہیں مگر منزل مقصود ایک ہے۔

جب یہ دونوں یونیورسٹیاں ان اصول اور اس مطمح نظر کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیں گی تو اس وقت خود بخود حسد ورقابت، تفریق ومنافرت اس ملک سے اٹھ جائیں گے۔ اور ہندوستان ایک ملک اور ایک قوم ہوگا۔ ہندوستان اور اس کی قومیت کے لئے وہ دن نہایت منحوس ہوگا اگر مسلمان اجنٹہ کی حیرت انگیز اور لازوال نقاشی یا ایلورا کی عجیب وغریب سنگ تراشی کے نمونے دیکھیں اور عش عش نہ کرنے لگیں یا وہ جیادیو کے من موہن گیت یا بھگوت گیتا میں سری کرشن کا پُرمعنی اور لطیف کلام پڑھیں اور وجد نہ کرنے لگیں۔ ہندوستان اور اس کی

قومیت کے لئے وہ دن نہایت منحوس ہوگا اگر دہلی و آگرہ میں مغلوں کی اور بیجاپور میں عادل شاہیوں کی نادرِ روزگار اور عالیشان عمارتیں دیکھ کر یا شیر شاہ، اکبر یا دکن کی چاند سلطانہ جیسے نامور فرماں رواؤں کے شاندار کارنامے یا محمود گاواں اور ابوالفضل جیسے وزرائے باتدبیر کے کارہائے نمایاں پڑھ کر یا البیرونی و فیضی جیسے حکما و مورخین کی تصانیف مطالعہ کر کے یا خسرو غالب اور حالی جیسے بلند پایہ شعرا کا حکیمانہ اور پُر درد کلام سُن کر ہندوؤں کے دلوں میں فخر و مسرت کی لہریں موج زن نہ ہوں۔ ہندوستان کی بڑی بدنصیبی ہوگی اگر کیننگ، رپن جیسے وائسرائے یا منرو اور الفنسٹن جیسے مدبرین یا اڈمنڈ برک اور جان برائٹ جیسے ہندوستان کے بہی خواہوں یا ہیر اور ملر جیسے مشنریوں کی نیک نفسی اور عالی ظرفی سے ہندو مسلمانوں کے دل متاثر نہ ہوں یہ سب ہندوستان کے دوست تھے اور ایسے سیکڑوں تھے جنہوں نے نیک نیتی سے ہندوستان کی خدمت کی۔ یہ سب مادرِ ہند کے سپوت ہیں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ہوں یا عیسائی۔ یہ مہر و آشتی کا دور ہوگا جب کہ مذہب و ملت کی تفریق دلوں میں تفرقہ پیدا نہیں کرے گی۔ اور یہ ان یونیورسٹیوں کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ اس وقت انہیں اور ایک کام بھی کرنا ہوگا جو اب تک نہیں ہوا۔ یعنے ہندوستان کی ایک جدید تاریخ لکھنی پڑے گی۔ جس میں ہندوستان کے محسنوں اور خدمت گزاروں کی محنتوں کی داد دی جائے گی۔ اور جو بجائے دلوں میں عداوت پیدا کرنے کے اتحاد اور قومیت کی تکمیل کرے گی۔

ہندوستان کیلئے جدید تاریخ کی ضرورت

اُس تاریخ میں ہمیں وہ واقعات نظر آئیں گے جن پر اس وقت پردہ پڑا ہوا ہے چنانچہ اسی قسم کا ایک واقعہ جس کا تعلق ہندوستان کی گزشتہ علمی مساعی سے ہے، آپ کے مشہور

مورخ مولف "پروموشن آف لرننگ ان انڈیا" (ہندوستان کی علمی ترقی) نے بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا طفیل تھا کہ بنگالی زبان آج ہندوستان کی زبانوں میں علمی لحاظ سے اس قدر ممتاز ہے۔ مسٹر نیدرا ناتھ لا کہتے ہیں:۔

بنگال کے فرمانرواؤں کی کوششیں صرف اسلامی علوم کی ترقی ہی تک محدود نہیں رہیں بلکہ ان کی علمی سرپرستی دوسری طرف بھی منعطف ہوئی جس کا جاننا اہل بنگال کے لئے خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہوگا انہیں یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ اُن کی زبان کی ادبی اور علمی ترقی اُن کی کوشش سے نہیں ہوئی بلکہ یہ درجہ اُسے مسلمانوں کی بدولت نصیب ہوا۔ اول اول اُن کی دلچسپی شوقیہ تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ اس کا تعلق سنسکرت سے ہے جسے ہندو قوم بہت عزیز رکھتی ہے جس سے مسلمانوں کو اکثر تعلق رہتا تھا۔ پہلے پہل بنگال کے مسلمان حکمرانوں نے رامائن اور مہابھارت کی طرف توجہ کی اور اُن کی سرپرستی میں ان دونوں کتابوں کے ترجمے بنگالی میں ہوئے۔"

"ایسی کتابوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے ترجمے فارسی اور سنسکرت سے مسلمان حکام کی سرپرستی میں بنگالی میں ہوئے۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ پہلے سنسکرت کے دلدادہ برہمن اور ہندو راجہ بنگالی زبان کو حقارت سے دیکھتے تھے لیکن اس کے بعد سے یہ بات نہ رہی ہندو راجاؤں نے بھی مسلمان بادشاہ اور حکام کی دیکھا دیکھی بنگالی مصنفین کی قدر کرنی شروع کی پھر درباروں میں بنگالی ملک الشعراؤں کا رکھنا ایک "فیشن" ہوگیا۔

مسٹر پی چودھری "بنگالی ادب کے داستان" میں لکھتے ہیں کہ بنگالی زبان جو بہ لحاظ اصل کے ہر دل عزیز ہے اور اس میں زیادہ تر جو جمہوریت کی شان پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بنگالی اہلِ علم کا تعلق اسلام سے رہا۔"

کبھی کرتے تھے ہم بھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکّہ جان و دل پر تھا
تمہیں لے دے کے بس اس داستاں کی یاد ہی تی
کہ عالم گیر ہند کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

قدیم مدارس کی اصلاح

اس کے علاوہ اس قسم کی یونیورسٹی کا ایک اور کام بھی ہوگا اور میں اس مسئلہ کی طرف آپ کی توجہ اس لئے زیادہ تر مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اس کی احتیاج اس صوبہ میں خاص طور پر پائی جاتی ہے یہ کام قدیم طرز کے مدارس کی اصلاح ہے۔ اس قسم کی یونیورسٹیوں کی علوم مشرقیہ یا دینیات کی فیکلٹی مشرقی علوم کے اُن مدارس کو جو اب تک نظامیہ نصاب کی تعلیم دیتے ہیں اپنے زیر اثر لا سکتی ہے۔ میں اپنے حیدر آباد کے تجربہ کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ علما اور طلبہ جو ان مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں ہماری قوم کے مفید اور کار آمد رکن ہیں۔ مذکورۂ بالا فیکلٹی ان مدارس کی تعلیم میں اصلاح کرکے زیادہ خود داری اور زیادہ وسعت نظر پیدا کر سکتی ہے۔ اور خود یونیورسٹی کا اس میں یہ فائدہ ہے کہ وہ ہر قسم کے علوم تہذیب ذوق کی جامع ہوگی۔ اس ضمن میں میں آپ صاحبوں کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات اس قسم کے مدارس کی اصلاح کے خواہشمند ہیں انہیں حیدر آباد جیسی اسلامی ریاستوں نیز مصر کے تعلیمی تجربوں سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ حیدر آباد میں دار العلوم اور مدرسۂ نظامیہ موجود ہیں جہاں کے طرز تعلیم اور نصاب سے ضرور ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ مصر کے وزیر تعلیمات کی مطبوعات کے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے ان میں خاص کر دینیات اور لڑکیوں کی تعلیم کے نصاب ہندوستان کے

اسلامی مدارس کے لئے بہت مفید معلوم ہوتے ہیں۔

سلطانیہ کالج

حضرات! اب میں اسی قسم کی ایک اور قابل قدر تحریک کا مختصراً ذکر کرنا چاہتا ہوں جو حال ہی میں پیدا ہوئی ہے۔ میری رائے میں یہ بابرکت تحریک مسلمانوں کے حق میں رحمت ثابت ہوگی یہ پہلا وقت ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اپنی تمام آئندہ امیدوں اور دنیاوی مسرتوں کو قربان کرکے قوم کی خدمت کے لئے کمر باندھی ہے۔ ہم میں کونسا مسلمان ہے جس کے دل میں یہ خیال نہ آیا ہو کہ کاش ہم میں بھی گوکھلے، پرنجپے، شاستری اور دیودھر جیسے سچے اور بے ریا خادمان قوم ہوتے۔ خدا کا شکر ہے کہ سلطانیہ کالج کے محرکوں اور بانیوں نے خلوص اور ایثار کی ایسی اعلیٰ مثال پیش کی ہے جو ہمارے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید اور ہم سب کے لئے قابل فخر ہوگی۔ ہم زیادہ تر اپنی خود غرضیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور جب تک ہم یہ نہ سمجھیں کہ معلم کی قدر دنیاوی مال و جاہ میں نہیں بلکہ اس کے استغنا، اس کی پاک اور شریفانہ زندگی اور اس کے خلوص و ایثار میں ہے، اس وقت تک ہمیں کسی ترقی کی امید نہیں کرنی چاہیے ہم معلمین کی کمی تنخواہ کے متعلق اکثر لوگوں کو شکایت کرتے سنتے ہیں یہ ہماری قدیم روایات کے خلاف ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان غریب مدرسین سے ہمدردی نہیں بلکہ میں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ ان کی قدر و قیمت روپیہ پیسے میں نہیں بلکہ اس ادب و احترام میں ہے جس کا یہ شریف پیشہ ہر طرح مستحق ہے۔ ہم اپنی قدر دانی اور عزت سے انہیں وہ کچھ دے سکتے ہیں جو سرکار یا ان کے افسر انہیں نہیں دے سکتے یہ ملک کی خوش نصیبی ہے کہ سلطانیہ کالج کے اراکین اعلیٰ تعلیم کی خدمت کرکے تعلیمی کارگزاروں کے لئے قدر و قیمت کا سچا اور صحیح معیار قائم

کرنے والے ہیں۔ ان کی بے ریا مساعی اہل ملک کے لئے خود ایک ایسی تعلیم ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم سے جو محض امتحانات میں کامیاب ہونے کے لئے حاصل کی جاتی ہے کہیں افضل و اشرف ہے۔ میں بانیان و محرکین سلطانیہ کالج کو ان کی مردانہ ہمت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اور روشن خیال و فخر قوم فرماں روائے ریاست بھوپال کے فرزند سعید پرنس حمید اللہ خاں کے جوش و حب قوم اور خلوص کی تعریف کرتا ہوں، جن کی حمایت و سرپرستی میں یہ کالج پھولنے پھلنے والا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ کالج ہر طرح کامیاب و سرسبز ہو اور اس کی تقلید میں ہندوستان کے ہر حصہ اور گوشہ میں اسی قسم کی درسگاہیں ایسے ہی ایثار و خلوص پر مبنی ہوں۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے ہم قوم اس کی تکمیل کے لئے دریا دلی کے ساتھ مدد دیں گے۔ اگر ہم نے اس کی اشاعت میں کوتاہی کی اور جلد اس کی تکمیل نہ کر دی تو ہماری خودداری میں نہایت بدنما دھبہ رہے گا۔ اور ہم ایک ایسے جرم کے مرتکب ہوں گے جو کبھی معاف نہ ہوگا۔

تعلیمِ نسواں

اس خطبہ میں یہ توقع رکھنا کہ میں مسلمانوں کی تعلیم کے ہر شعبہ پر گفتگو کروں امکان سے خارج ہے دوسرے اگر میں کوشش بھی کروں تو محض آپ کی سمع خراشی ہوگی۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ میں گزشتہ دو تین سال کے اندر اول حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس میں اور پھر ایک سال قبل جنوبی ہند کی ایجوکیشنل کانفرنس میں ان میں سے بعض مسائل پر کافی بحث کر چکا ہوں لیکن میرے اس سکوت سے ہرگز یہ خیال نہ کیا جائے کہ میری ان رایوں میں کسی قسم کا ضعف پیدا ہو گیا ہے یا میں انہیں ان مسائل سے جن پر میں نے آج بحث کی ہے کم اہم سمجھتا ہوں۔ میری مدت سے یہ رائے ہے اور اب بھی میں اسی وثوق اور یقین کے ساتھ

اس پر قائم ہوں کہ لڑکیوں کی تعلیم اسی قدر ضروری ہے جتنی لڑکوں کی بلکہ میرے خیال میں بعض حالتوں میں یہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ اگر آپ نے اپنی لڑکیوں کو معقول تعلیم دیدی تو اس کے یہ معنے ہیں کہ آپ نے اپنے لڑکوں کی تعلیم کی بہترین صورت نکال لی۔ جیسا کہ میں نے اردو کی تعلیم کا انتظام اور مکاتب کی اصلاح کے ذیل میں کہا ہے وہی اس مسئلہ خاص کے متعلق کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں واقعات کا مطالعہ بہت احتیاط، غور اور صبر کے ساتھ کرنا چاہیئے اور خاص پروگرام تعلیم کا مرتب کرلینا چاہئے۔ جس میں قطعی طور پر یہ فیصلہ کرلیا جائے کہ مدت تعلیم کیا ہوگی اور اس مدت میں ہر سال کی تعلیم کا کیا اندازہ ہوگا تاکہ جو مقصد ہمارے پیش نظر ہے وہ اس عرصہ میں حاصل ہوجائے۔ کام کرنے والی جماعت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان واقعات کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس پروگرام کی پوری پابندی کی جاتی ہے یا نہیں۔ استانیوں کی مطلوبہ تعداد مہیا ہوگئی یا نہیں۔ مناسب تعداد لڑکیوں کی مدرسہ میں آتی ہے یا نہیں اور اس کام کے چلانے کے لئے کافی رقم جمع ہوگئی یا نہیں۔ گورنمنٹ کی مدبرانہ دانشمندی اور تعلیمی ہمدردی پر مجھے اس قدر یقین ہے کہ بطور اصول موضوعہ کے یہ فرض کرلیتا ہوں کہ وہ ابتدائی تعلیم کی توسیع میں کبھی روپیہ کا منہ نہیں کرے گی اگر لوکل فنڈ کی رقم کافی نہ ہوئی تو حتی الامکان دوسرے مقامی ذرائع سے اس میں اضافہ کردیا جائے گا اگر یہ بھی ممکن نہ ہوا تو صوبہ کی آمدنی یا شاہی آمدنی سے کمی پوری کردی جائے گی لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم نسوان کی توسیع کے متعلق ہمارا مطالبہ صحیح معلومات پر مبنی اور مناسب صورت میں ہو۔ اور گورنمنٹ ہر طرح سے معین اور کافی تدابیر اس مطالبہ کے پورا کرنے کے لئے عمل میں لائے۔

کتب خانے

کتب خانوں کا مسئلہ لیجئے۔ یہ بھی کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی اشاعت میں یہ بہت بڑا ذریعہ ہیں خصوصاً اگر ان کتب خانوں میں دیسی زبانوں کی کتابیں اور اخبارات اور رسالے ہوں۔ کیوں کہ اُن مردوں عورتوں کے لئے جو اپنے مطالعہ اور شوق سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جنہوں نے ہماری ابتدائی مدارس میں اپنی زبان کی مناسب تعلیم پائی ہے۔ مگر افلاس یا ملکی رسم و رواج کی وجہ سے علمی زندگی سے محروم رہ گئے ہیں۔ یہ کتب خانے ہائی اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا کام دیتے ہیں۔ اگر اس قسم کے کتب خانوں کا انتظام صحیح اصول پر ہو اور تمام ملک میں ہر مقام پر ان کے قیام کا بندوبست کیا جائے تو میرے خیال میں وہ ملک کی علمی اور دماغی ترقی کے لئے ایسے ہی ضروری ہیں۔ جیسے کثرت کے ساتھ ملک میں ایسے مدارس کا ہونا جو صحیح اصول پر عمدہ انتظام اور کافی نگرانی میں ہوں۔

مقامی مسائل

کلکتہ یونیورسٹی کی سینٹ اور سنڈیکیٹ میں مسلمانوں کی کافی نیابت! اُن ڈیڑھ ہزار مسلمان طلبہ کی اقامت کا انتظام جو مفصلات سے کلکتہ میں بہ غرض حصول تعلیم موجود ہیں اور جنہیں اس غدار شہر میں جہاں ہر قسم کی موجبات ترغیب ہیں اپنے اپنے رہنے کا خود انتظام کرنا پڑتا ہے! اسلامی نقطۂ خیال سے مختلف نصاب ہائے تعلیم کی نظر ثانی، خصوصاً موجودہ فارسی عربی کا اجتماعی نصاب جسے تقسیم کر کے وہ جدا جدا مستقل مضامین بنانے کی ضرورت ہے، اور ان مدارس اور کالجوں میں جہاں مسلمان طالب علموں کی تعداد معتد بہ ہے، ان مضامین کی

تعلیم کا کافی اور مزید انتظام یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامی مسائل کو لائق مقررین جن کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے۔ زیادہ تفصیل اور خوبی کے ساتھ پیش کریں گے اس لئے میں ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ البتہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے متعلق صرف اس قدر کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ امر مخالف و موافق سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسلمانان مشرقی بنگال کی تعلیمی ترقی کی طرف سے بہت زیادہ اور نامناسب عرصہ تک غفلت کی گئی ہے۔ ان کی آنکھیں اب یونیورسٹی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور اُن کے مایوس دلوں کو اس امید نے بہت کچھ ڈھارس دے رکھی ہے۔ کہ اس یونیورسٹی کی بدولت گزشتہ غفلت کی تلافی ہو گی اور خصوصاً اسلامی کالج اور شعبۂ علوم اسلامیہ کے قیام سے انہیں اعلیٰ تعلیم میں بڑی مدد ملے گی۔

ہز اکسلنسی وائسرائے بہادر نے حال ہی میں اس یونیورسٹی کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ یہ یونیورسٹی بلا مزید تاخیر کے قائم ہو جائے گی لیکن اس موقع پر میں اس قدر اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یونیورسٹی کی تعلیم اور اس کی انتظامی مجلسوں میں ان لوگوں کی نیابت اور حقوق کا خیال نہ رکھا گیا۔ جن کے فائدے کی غرض سے ابتداءً اس کے قیام کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس بارے میں خاص احتیاط عمل میں نہ آئی تو اس کی اصل غرض و غایت فوت ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں میں اپنے ان الفاظ کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں جو میں نے گزشتہ سال جنوبی ہند کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے کہے تھے:۔

"میں اس کا سخت مخالف ہوں کہ ہم اپنی درخواست بھکاریوں کی طرح سرکار کے سامنے لے کر جائیں یا ہم اس کا مطالبہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں بطور خاص رعایت کے

کریں۔ جو ہماری جیسی قوم کی خودداری کے منافی ہے۔ میں نے ان رعایتوں یا مطالبہ کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہ ہندوستان کے عام فوائد کے لئے نیز دوسری اقوام اور گورنمنٹ سب کے حق میں بہتر اور مفید ہوگا۔ میں ہر تدبیر سے زیادہ مقدم اور زیادہ اہم اس اصول کو سمجھتا ہوں کہ مسلمان ہر معاملہ میں اپنی مدد کے لئے خود آمادہ ہوں اور اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا سیکھیں اور اس بنا پر ان کا یہ فرض ہے کہ وہ تعلیمی اغراض کے لئے ہر قسم کا بار اٹھائیں اور مشقت سہیں۔ اور کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مسلمان گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ان پر ایک تعلیمی سیس اُس ٹکس کے ساتھ اضافہ کر دیا جائے جو وہ زرِ مال گزاری یا انکم ٹکس یا کسی اور ذریعہ سے سرکار کو ادا کرتے ہیں۔ اس سے اُن کی خواہش اور مطالبہ کی صداقت کا ثبوت ملے گا اور اس وقت تمام ذرائع کے استعمال کرنے کی کوشش کے بعد اُن کے مطالبات میں سے رعایت کا بدنما لفظ خود بخود خارج ہو جائے گا لیکن قبل اس کے کہ اس قسم کی تجاویز قطعی طور سے طے کی جائیں یا کوئی درخواست گورنمنٹ میں پیش کی جائے۔ ضرور ہے کہ اعداد و شمار اور وسائل و ذرائع وغیرہ کی کامل تحقیقات کر لی جائے لیکن موجودہ حالت میں اس سے بہتر اور کارگر کوئی تجویز نہیں بتا سکتا جو میں نے خاص مسلمانِ جنوبی ہند کے تعلیمی مسائل کے متعلق پیش کی ہے۔"

تحقیقاتی کمیشن

حضرات! نہ تو مجھے اتنی مہلت ہے اور نہ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ میں ان مسائل پر بحث کروں جو اس وقت کئی کمیشنوں کے سامنے پیش ہیں اور جن کے اجلاس ہندوستان میں ہو رہے ہیں۔ لیکن مجھے حُسنِ اتفاق سے اُس کمیشن کے ارکان کے ساتھ کئی گھنٹے بسر

کرنے کی عزت حاصل ہوئی جو اس وقت اسی شہر میں ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے معاملات پر غور کر رہا ہے۔ اس ملاقات اور گفتگو کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تحقیقات اور غور و فکر کا نتیجہ کچھ بھی ہو اور خواہ ہم اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن اس کا مجھے پورا یقین ہے کہ جو کچھ وہ کہیں گے یا لکھیں گے وہ ہندوستان کی تعلیمی فلاح اور نیک نیتی پر مبنی ہوگا۔ اور وہ دیگر اثرات سے متاثر نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کمیشن جس کا صدر ڈاکٹر سیڈلر سا عالم، وسیع النظر، ہمدرد اور ماہر فن تعلیم ہے۔ وہ ہماری بہت سی مشکلات کو جو ہندوستان کی تعلیم یونیورسٹی کی راہ میں پیش آرہی ہیں، آسان کرنے کی کوشش کرے گا مثلاً ایک الحاق ہی کا مسئلہ ہے جس میں سخت اختلاف ہے۔ حامیان الحاق کا منشاء یہ ہے کہ علم کی عام اشاعت ہو اور طلبہ علی تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ دوسری طرف مخالفین الحاق کا یہ خیال ہے کہ ناقص تعلیم کی اشاعت سے کچھ فائدہ نہیں علم پختہ اور گہرا ہونا چاہئے اور یونیورسٹی حقیقی علم و فضل اور علمی تحقیقات کی مرکز ہو۔ اب یہ ان ماہران تعلیم کا کام ہے کہ ملک کی ضروریات اور حالات پر غور کر کے کوئی ایسا راستہ نکالیں کہ ہمارے طالب علم اعلیٰ تعلیم سے بھی محروم نہ رہیں۔ اور ہماری یونیورسٹیاں حقیقی علم و فضل کا مرکز بھی بنی رہیں۔

ایک دوسرا کمیشن ہندوستان کی حرفت، صنعت اور تجارت پر غور کر رہا ہے۔ اس کمیشن کے صدر سر ٹامس ہالینڈ ہیں جو اس سے قبل ہندوستان میں بسلسلہ ملازمت رہ چکے ہیں اور اس کے ارکان میں سر راجندر ناتھ مکرجی، سر دارا ب تاتا، سر فاضل بھائی کریم بھائی سے تجربہ کار اور ماہران حرفت و صنعت ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس امر کو بلا رو و رعایت صاف صاف بتا دیں گے کہ اگر معاملات کی حالت یہی رہی جو ہمیں بمبئی کی شہادت سے چمڑے اور خیموں اور ہسپتال کے سامان کے بہم پہنچانے کے متعلق معلوم ہوئی ہے تو حرفت و صنعت و تجارت کی

تعلیم ہماری حرفت و صنعت و تجارت کی ترقی میں کچھ مدد نہیں دے گی۔ بجز اس کے کہ منشیوں اور محرروں کی ایک اور نئی جماعت پیدا کر دے۔

مجھے اس میں شبہ نہیں کہ لارڈ مارلے کا شاگرد رشید جو اس وقت خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں موجود ہے وہ مدبرانہ تخیل سے کام لے کر ہندوستان کی سیاسی حالت کو ایسی بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ جس کی توقع لیں نے اس صدی کے پہلے سال میں ظاہر کی تھی۔ مہارشی مہادیو گوبند رانا ڈے نے ہندوستان کی سوشل ریفارم (اصلاح تمدن) پر مختلف مضامین لکھوائے تھے۔ اور اسی بزرگ کی فرمایش سے میں نے "ہندو مسلمانوں کے تعلقات" پر ایک مضمون لکھا تھا۔ جسے میں ہندوستان کا ایسا اہم اور بڑا مسئلہ سمجھتا ہوں کہ اس کے حل ہونے پر دوسرے تمام مسائل کا دارومدار ہے۔ اس میں میں نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ "اس وسیع براعظم کے مختلف اقوام و ملل کے قلوب اتفاق کی برکت سے متحد ہو جائیں۔ ایسے اتفاق سے نہیں جو عارضی اور سرسری ہو، یا یہ کہ ہندو مسلمان پارسی اور عیسائی ایک دوسرے کو نظر رواداری سے دیکھیں۔ یا ایسی ہمدردانہ عنایت سے جس میں غیریت کی بو آتی ہو۔ بلکہ ایسے اتفاق سے جس میں زندگی اور حرکت ہو اور جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں اور مشترکہ ارث کی ترقی اور نشو و نما کے لئے مل کر کام کریں، تب ہمارے مردوں اور عورتوں میں خودداری پیدا ہوگی اور ہمارا ملک اس قابل سمجھا جائے گا کہ وہ برطانیہ کے ملحقہ خود مختار حکومتوں کے برابر جگہ پائے۔"

یہ مشہور مقولہ ہے کہ جنگ کے شور و شغب میں تمام قوانین معطل ہو جاتے ہیں۔ لیکن برطانوی امن و امان کی کوئی تعریف اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ اس نے اس عالم گیر

طوفان خیز جنگ کے زمانہ میں اپنے نائب و سفیر کو اُس مہتم بالشان قانون کی بنیاد قائم کرنے کے لئے بھیجا ہے جو صرف ایک فرماں بردار قوم ہی کا حق ہے۔ یعنے آزادی کا وہ فرمان محکم جو محکوم قوم کو اپنے حقوق و اقتدارات اور ذمہ داریوں میں حاکم قوم کے مساوی بنا سکتا ہے۔

شمشیر تعلیم

حضرات! یہ زمانہ بہت نازک ہے۔ ہر طرف انقلاب کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ جدید حالات و واقعات نے خیالات میں تغیر و تزلزل پیدا کر رکھا ہے۔ ہر قوم اپنے سنبھالنے اور اپنی اصلاح کی فکر میں ہے۔ باوجودیکہ اس وقت تمام عالم میں ایک کہرام مچا ہوا ہے اور فلکِ سیاست پر آلام و مصائب کی گھٹائیں گھر گھر کر آرہی ہیں۔ تاہم وہ دول بھی جو اس منحوس اور خونخوار جنگ میں مبتلا ہیں۔ اور جن کے تمام ذرائع، جان و مال، ساری ہمت و قوت جنگ کے نذر ہے۔ ایسے نازک وقت میں اپنی قوم کی تعلیم سے غافل نہیں ہیں۔ ان جدید حالات نے اس امر کو اور واضح اور نمایاں کر دیا ہے کہ دنیا میں وہی قوم زندہ اور سرسبز رہ سکتی ہے جس کی تعلیم صحیح اصول پر ہے۔ پس ایسی صورت میں ہم پر جو تعلیم میں دوسروں سے پس ماندہ اور اپنی حالت میں دیگر اقوام سے درماندہ ہیں۔ سخت ذمہ داری ہے۔ ہم اگر اپنی رفتار معمول سے زیادہ تیز نہیں کریں گے۔ اور اگر ہمارا احساس اس بار میں قوی نہیں تو اس میں ذرا شبہ نہیں۔ کہ ہم اس عالمگیر جد و جہد میں پیچھے ہی نہیں رہ جائیں گے بلکہ اغلب ہے کہ کچل دئے جائیں۔

ایک انگریزی گیت میں ایک بڑے مزے کی اور سبق آموز کہانی ہے:۔
لکھا ہے کہ ایک مسافر راستہ بھول گیا اور پہاڑوں میں ٹھکراتا پھرتا تھا۔ پھرتے پھرتے وہ

پہاڑ کی ایک کھوہ میں پہنچا جہاں اس نے ایک بڑا مکان دیکھا جو طلسمات کا گھر تھا اس میں تمام سورما سپاہی سر سے پاؤں تک ہتیاروں سے سجے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے اور ان کے پاس ان کے گھوڑے بھی اسی طرح بے حس کھڑے تھے۔ اتنے میں اس کی نظر ایک چٹان پر پڑی جس پر ایک تلوار اور ایک قرنا رکھی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ جو کوئی اس فوج سے کام لینا چاہتا ہے اُسے چاہئے کہ ان دونوں چیزوں میں سے کوئی ایک پسند کرلے۔ مسافر نے قرنا اٹھالی اور زور سے پھونکی اس کے پھونکتے ہی ساری فوج ایک آندھی میں غائب ہوگئی اور مسافر جہاں سے آیا تھا وہیں پہنچ گیا۔ مگر اس کے پیچھے پیچھے ہوا میں پیہم یہ آواز آرہی تھی :

"لعنت ہے اس بزدل پر جس نے تلوار کھینچنے سے پہلے قرنا پھونکی"۔

حضرات! کسی شخص کو اعلان جنگ کا حق نہیں ہے جب تک کہ پوری طرح وہ کیل کانٹے سے لیس نہ ہو اسی طرح کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ دنیا کی جد و جہد میں داخل ہو جب تک وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار نہ ہو۔ ہم میدان میں اتر آئے ہیں۔ ہمیں خوب دیکھ لینا چاہئے کہ ہم نے اس نقشے اور اس نظام عمل پر کامل غور کرلیا ہے جس پر ہمیں کاربند ہونا ہے ؟ ہمارے پاس وہ تمام سامان مہیا ہے جو اس کارزار کے لئے ضروری ہے ؟ اگر کچھ کسر باقی ہے تو اب بھی ہم اس کی تلافی کرسکتے ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہم تمام رخنوں کو بند کریں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ دوش بدوش چلیں ان کے ساتھ مساوی حیثیت میں رہیں۔ ان کے برابر بیٹھ کر ملکی معاملات پر بحث کریں۔ ملک میں اپنی ہستی اور وقار کو قائم رکھیں اور ان کے ساتھ متفق و متحد ہو کر اقوام عالم میں ہندوستان کو سرخرو اور ممتاز کریں تو اس کے لئے صرف ایک

ہتیار ہے اور فضائے عالم میں یہ آواز گونج رہی ہے کہ "قرنا پھونکنے سے پہلے تلوار کھینچو" یہ تلوار تعلیم کی تلوار ہے۔ جو اس زمانہ میں ہماری عزت و آبرو اور ہماری ترقی و خوش حالی کی حفاظت کے لیئے لازم ہے۔ اور جسے ہاتھ میں لینے کے لیئے ہمیں ہر قسم کی قربانی کے لیئے تیار رہنا چاہیئے تاکہ دیو جہالت جو اس ملک پر مسلط ہے اس کے زور سے مغلوب اور زیر ہو۔ اور فرزندان ملک خدا کی اس سرزمین پر امن و آزادی سے رہ سکیں۔ جن کے دل قدیم زمانہ کی شان و شوکت اور کامیابیوں سے مسرور اور آئندہ زمانہ کے توقعات و برکات سے معمور ہوں۔

چند اعداد و شمار

متعلقہ صفحہ (۸۳)

بہرحال کچھ اعداد جو میں نے فراہم کیئے ہیں ان سے ہماری تعلیم کی حقیقت کسی قدر واضح ہو جائے گی۔

برٹش انڈیا میں تعلیم کے متعلق جو آخری سالانہ اعداد شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء کو سرکاری اور پرائیوٹ درس گاہوں میں مسلمان لڑکوں کی تعداد تقریباً پندرہ لاکھ اور لڑکیوں کی دو لاکھ پچہتر ہزار تھی۔ جس کے مقابلہ میں ۱۹۱۶ء میں تعداد علی الترتیب (تیرہ لاکھ پچاس ہزار) اور (دو لاکھ پچیس ہزار) تھی۔ یہ اضافہ خصوصاً لڑکیوں کی تعداد میں قابل اطمینان ہے۔ لیکن نہ اس قدر کہ ہمارے لیئے باعث مسرت ہو۔ برٹش انڈیا میں مسلمانوں کی مردم شماری ۵ کروڑ ۷۰ ½ لاکھ ہے۔ اور لڑکے لڑکیوں کو ملا کر مدرسہ جانے والوں کی تعداد کا

تناسب ۵ فی صدی کے مفروضہ تناسب سے بھی کم ہے۔ لیکن یہ یقین کرنے کے لئے معقول وجوہ ہیں کہ کم از کم ہندوستان میں یہ مفروضہ تناسب حقیقی تناسب سے بدرجہا کم ہے۔ حال ہی میں آپ کے شہر کے مشہور و معروف رسالہ ماڈرن ریویو نے ٹراون کور کے انتظامی رپورٹ سے ایک اقتباس شائع کیا تھا کہ ۵ فی صدی کا تناسب جو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے حقیقی تناسب سے بہت ہی کم ہے۔ چنانچہ رپورٹ نے اس امر پر اس طرح نظر ڈالی ہے کہ ایک تعلقہ میں زیر تعلیم طلبا کی شرح سو فی صدی سے زائد تھی جو بہ ظاہر مہمل ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ مدرسہ جانے والے طلبا کا اوسط ۵ فی صدی خواہ مخواہ فرض کر لیا گیا ہے اسی بنا پر اس رپورٹ میں مدرسہ جانے والے طلبہ کا اوسط بہ مقابلہ آبادی کے بجائے پندرہ فی صدی کے ۲۵ فی صدی فرض کر لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی اوسط پیدائش کو ملحوظ رکھ کر جو بہت زیادہ ہے یہ زیادہ معقول ہوگا کہ مدرسہ جانے والے آبادی کا تناسب بمقابلہ کل آبادی کے ۵ فی صدی سے زیادہ رکھا جائے جس حالت میں کہ موجودہ مفروضہ تناسب کے حساب سے مسلمانوں کی تعلیمی پستی اس قدر زیادہ ہے اگر حقیقی تناسب کے لحاظ سے دیکھا جائے گا تو یہ پستی اور بھی زیادہ معلوم ہوگی۔

جن اعداد و شمار کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے وہ اگرچہ مایوس کن ہیں لیکن جب ہم ان اعداد زیر تعلیم کے مختلف مدارج کے لحاظ سے نظر ڈالتے ہیں تو یہ مایوسی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ کالجوں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد صرف چھ ہزار ہے۔ اور مدارس ثانویہ میں ان کی تعداد تخمیناً دو لاکھ ہے۔ ابتدائی مدارس میں مسلمان طالب علموں کی تعداد سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جو تعداد کثیر یعنے ۱۲۴۰۰۰۰ ہے اگر کامل تحقیقات کی جائے تو ظاہر ہوگا کہ ابتدائی مدارس کے کثیر التعداد طلبہ ابجد خوان ہیں مسلمانوں کی آبادی کی تعداد

برٹش انڈیا کی کل آبادی کے مقابلہ میں ۱/۵ ہے۔ لیکن مسلمان طلبار کا تناسب جو کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں ۱/۹ اور مدارس ثانوی میں ۱/۵ سے کم ہے۔

البتہ یہ قابل لحاظ ہے کہ جو طلبا مدارس خاص میں تعلیم پاتے ہیں ان پچاس فی صدی سے زائد مسلمان ہیں۔ یہ امر ایسا نہیں ہے جو نظرانداز کردیا جائے۔ اس لئے میں یہاں صحیح اعداد کا پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

مدارس صنعت وفنون میں آخر مارچ ۱۹۱۶ء میں کل ۱۶۱۳۰۸ طلبار تھے جن میں سے ۸۱۷۰ مسلمان تھے۔

ان اعداد سے میرے خیال میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان لڑکے جو زیادہ تعداد میں مدارس ابتدائی صنعتی میں پائے جاتے ہیں۔ اور ثانوی مدارس میں ان کی تعداد بہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ثانوی مدارس کی ایک تو تعداد کم ہے دوسرے فیس اس قدر زیادہ ہے کہ مسلمان غیر مستطیع طلبہ اس کے ادا کرنے سے قاصر ہیں اگرچہ یہ امر مسلم ہے کہ ثانوی تعلیم ہماری قوم کے لئے بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ ضروری اور مفید ہے۔ موجودہ حالت میں ہماری قوم کے اکثر نوجوان اپنی تعلیم یونیورسٹی سے محروم ہیں۔ وہ مجبورًا ابتدائی تعلیم کے بعد ذریعۂ معاش حاصل کرنے کے لئے مدارس حرفت وصنعت میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ثانوی تعلیم کی مناسب اصلاح کردی جائے اور ساتھ ہی اُن کی تعداد میں اضافہ اور فیس میں کمی ہوجائے تو اس سے مسلمان طلبہ کو بہت زیادہ فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ خصوصًا ان طلبہ کو جو یونیورسٹی کی تعلیم کے خواہشمند ہیں۔ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہونے کی حیثیت سے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے یونیورسٹی کی تعلیم سے کافی طور پر فائدہ حاصل نہیں کیا۔ گو یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک آدھ شخص اپنی ذاتی سعی سے ملک میں امتیاز و وجاہت حاصل کرے

مگر یہ ناممکن ہے کہ اس زمانہ میں جو جد وجہد اور مسابقت کا مظہر عظیم ہے ہماری قوم اس وقت تک دوسری اقوام کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتی جب تک کہ ہمارے طلباء بھی انہیں کی طرح اعلیٰ تعلیم و تربیت سے مسلح نہ ہو جائیں۔ لارڈ ہالڈین نے جس کی رائے مسائل تعلیمی میں مستند مانی جاتی ہے ایک عام جلسہ میں اثنائے تقریر میں کیا خوب کہا کہ اعلیٰ ترین تعلیم کا دروازہ امیر و غریب سب کے لئے برابر کھلا رہنا چاہئے کیوں کہ اعلیٰ ذہانت کچھ امراء کی وراثت نہیں۔ خدا نے غریبوں کو بھی یہ نعمت بخشی ہے۔ اور اگر کوئی قوم اپنے بچوں کی قابلیت اور صلاحیت سے غفلت کرے گی تو دنیا میں اس کا عزت سے رہنا مشکل ہو گا۔

خطبۂ کانووکیشن جامعۂ پنجاب

منعقدہ ۱۹ر دسمبر سنہ ۱۹۲۵ عیسوی

یور ایکسی لنسی۔ معزز نائب امیر جامعہ رفقائے مجلس انتظامی (سن ڈیکیٹ)، اور جامعہ پنجاب کے فارغ التحصیل حضرات۔

آپ کے معزز نائب امیر جامعہ نے (وائس چانسلر) سالانہ خطبۂ کانووکیشن پڑھنے کی مجھے لاہور میں شفقت آمیز دعوت دی۔ مجھے اس دعوت کے قبول کرنے میں ایک خاص مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ ملازمت کی ابتدا ہی میں میری تعیناتی اس پرانے شہر میں ہوئی۔ اس وقت میں یہاں بہت کم مدت ٹھیر سکا۔ لیکن اس تھوڑے سے زمانہ قیام میں مجھے بہت سے ایسے احباب سے شناسائی کا شرف حاصل ہوا جن کے نام آپ کی جامعہ کی تقویم (کالنڈر) کے صفحوں کی زینت ہیں۔ دو نوں قزل باش بھائی سر نوازش علی اور ناصر علی، دو درویش کامل قمرالدین اور جمال الدین دو بڑے قانون داں سر پرتول چندر اور لالہ مدن گوپال اور خان بہادر برکت علی اور مفتی سلیم اللہ جو بجائے خود ایک جدا جدا طبقہ کا حکم رکھتے تھے یہ کیا خوبیوں کے انسان تھے، کرم فرما، با وقار اور علم میں رچے ہوئے بھلے لوگ جو افسوس ہے کہ اب اپنی سرگرمیوں کی جولانگاہوں سے ناپید ہو چکے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اب بھی آپ لوگوں کے درمیان ایسے چند نفوس سرگرم کار ہیں جن سے اس زمانہ میں مجھے ملنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جن کی ملاقات کا فخر مجھے بعد میں آپ کے صوبہ کی حدود کے باہر حاصل ہوا۔ ان لوگوں میں ایک تو آپ کے صوبہ کے ممتاز صدر حکومت ہیں جن کے تحت کام کرنے کی مجھے اس وقت مسرت نصیب ہوئی جب کہ برطانوی مملکت ہند کے مالیات کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی دوسرے آپ کے فاضل نائب امیر جامعہ ہیں ان سے مجھے ملاقات کی ایک مدت سے آرزو تھی۔ کیوں کہ ان کو ہندوستانی فنون لطیفہ اور کلچر سے گہری دلچسپی ہے اور حسن اتفاق سے میں ہندوستانی جامعوں کی کانفرنس کے موقع پر ان سے مل بھی چکا ہوں۔ تیسرے میرے معزز میزبان ڈاکٹر سر میاں

محمد شفیع ہیں جن کے سر کئی کارناموں کے اعزاز کا سہرہ بندھ چکا ہے۔ اور جن کی ذات سے ابھی بہت سے کاموں کی توقعات وابستہ ہیں۔ چوتھے آپ کے ناظم تعلیمات ہیں۔ یہ دراصل میرے ہی صوبہ سے تشریف لائے ہیں اور جنہوں نے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گذرے کہ پونا کی مسلم کانفرنس کے روبرو پنجاب کے تعلیمی کارناموں کا قابل قدر تذکرہ پیش کیا تھا۔ یہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے ان تھک معتمد تھے اور اجنٹا اور بعد حیدرآباد میں مجھ کو ان کے اور سرمائیکل ساڈلر اور دیگر ارکان کمیشن کے ساتھ جو دن گذارنے کا موقع ملا وہ دن میری یاد کے خزانہ میں ہمیشہ جگا جگا کر رکھے جائیں گے۔ اور پانچویں آپکے نہیں مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ ہمارے قومی شاعر ہیں جن کی شاعری کی بانگ دراصرف ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ ساری ایشیاء کی فضا میں گونج رہی ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے، آپ کی دعوت سے مجھے سچی مسرت ہوئی اس لئے کہ اس بہانہ سے مجھے ایک ایسے شہر کو پھر دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا جو بہت سی تاریخی اور شخصی باتوں کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ جب میں نے ان اصحاب کی فہرست پر نظر دوڑائی جو زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز پا چکے تھے اور جنہوں نے آپ کو مخاطب کیا تھا خصوصاً سر آشوتوش مکرجی کی بڑی اور زبردست شخصیت پر جب میری نظر پڑی جن کا نام میرے قریب کے پیش رو اصحاب میں ہے اور جن کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے کل علمی دائرہ کو اپنی مملکت اور تعلیم کے میدان کو اپنی قلمرو بنا لیا تھا تو میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ آج جو میں آپ کو خطاب کر رہا ہوں۔ اس ذمہ داری کے کام کو میں نے بہت کچھ دھڑکتے دل کے ساتھ اور ہچکچاتے ہوئے قبول کیا اب چونکہ میں اس ذمہ داری کو اپنے سر لے چکا ہوں میں آپ کو کم سے کم اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں ہندوستانی

طالب علم کی خواہ وہ کہیں ہو اصلی اور اخلاص مندانہ ہمدردی اور ہندوستانی تعلیم کے کام کی ترقی کی مستقل اور خالص آرزو ان باتوں میں ان اپنے پیش رو نامورروں سے مساوات کے دعوے کی جسارت کرسکتا ہوں۔ البتہ جہاں تک علم و فضل اور خداداد دماغی استعداد کا تعلق ہے میں اس بارے میں اپنے آپ کو جتنا کچھ سمجھوں اس سے بڑے لوگ کہیں بڑھے چڑھے تھے اس لئے اے جامعہ پنجاب کے فارغ التحصیل نوجوانوں مجھے امید ہے کہ میں جو امور آپ کے سامنے پیش کروں گا آپ ان باتوں سے اکتائیں گے نہیں اور اس بات کو یاد رکھیں گے کہ یہ الفاظ ایک ایسے شخص کی زبان سے نکلیں گے جس کے دل میں آپ کا درد ہے اور جو آپ کی طرح ایک ہندوستانی کالج میں طالب علم رہ چکا ہے اور جس نے عمر بھر ایک طالب علم بنے رہنے کی کوشش کی ہے اور اس حیثیت سے آپ کی احتیاجوں، بلند حوصلوں، اور خدشوں کا درد شریک کی طرح پورا پورا احساس رکھتا ہے۔

ہندوستانی جامعہ کے فرائض

میں یہ کہتا ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ میں وہی بات دہرا رہا ہوں جس کی آواز ہر طرف سے آرہی ہے اور مختلف الرائے اصحاب بھی جس معاملہ میں ہم زبان ہیں کہ ہمارا ہندوستانی نظام جامعہ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارا سارا نظام تعلیمی اپنے مقاصد کے حصول میں بہتر طور پر کامیاب ہوگا اگر اس کو ہمارے وطن کی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ اور زیادہ وابستہ کر دیا جائے یہ اب محسوس ہونے لگا ہے کہ اس وقت ملک کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ غیر معین طور پر روز افزوں ایف۔ اے اور بی۔ اے پاس لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے اور یہ تعداد سرکاری ملازمت کی خواہاں رہے۔ اور یہ

ملازمت کے نہ ملنے کی صورت میں بے روزگاروں کی فوج میں اور اضافہ کردے۔ اس طرح کے بے روزگاری کے شکار بے چین رہیں گے۔ اور جو لوگ ہندوستانی طالب علم سے ذرا سی بھی ہمدردی اور ہندوستانی نظامِ تعلیمی کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ ناانصافی کے احساس پر مبنی بے چینی بے جا نہیں۔ ملک کو ضرورت ایسے آدمیوں کی ہے جو ملک کی بقا کے ہر قسم پیشوں اور کاروبار میں کھپ جائیں یہ لوگ صرف تعلیم یافتہ ہی نہ ہوں بلکہ جہاں تک ہو سکے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہ خصوصیت کے ساتھ اس کام کے تربیت یافتہ ہوں جوان کو تعلیم سے فارغ ہو کر کرنا ہوگا۔ یہ ایک مسلمہ سی بات ہے کہ بحالت موجودہ ہندوستان کو ضرورت تربیت یافتہ ماہرینِ زراعت، تربیت یافتہ کاروباری لوگوں کی ہے۔ دفاتر کے کلرکوں کی نہیں۔ تربیت یافتہ انجنیر، ڈاکٹر، کارخانہ دار اصحاب فنونِ لطیفہ، صناع، لوہار، جلاہے، کمہار۔ غرض کہ بجز کلرکوں کے اور ہر چیز میں تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بھی تربیت یافتہ یا کم سے کم صاحبِ اسناد کلرکوں کی تعداد مانگ سے بڑھی ہوئی ہے۔ حالانکہ ملک کا پیداواری کام بیشتر ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو نسبتہً باحسن وجوہ اپنے کام کو انجام نہیں دے سکتے، اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ دولت (اسٹیٹ) یا قوم کے لئے یہ بات کبھی مفید نہیں ہو سکتی کلرکوں (اور عہدہ داروں) کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا جائے۔ اور اس طرح نظم ونسق کی مشین ہی پیچیدہ اور محض نظم ونسق کے مصارف زیادہ ہوتے جائیں۔ دولت کا مطمحِ نظر تو یہ ہونا چاہئے کہ کلرکوں (اور عہدہ داروں) کی اقل تعداد مستقلاً معین ہو جائے۔ لیکن تربیت کے ذریعہ یہ تعداد پوری طرح کارآمد اور کارگذار بنائی جائے۔ اس سے ایک طرف مشنری سیدھی سادھی رہے گی اور دوسری طرف

نظم و نسق کے مصارف میں بھی تخفیف ہو جائے گی اور دولت کو اس بات کا موقع ملے گا کہ ہر ممکنہ ذریعہ سے ملک کی پیداوار ثروت کو پال پوس سکے۔ ہندوستان میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تاریخی اتفاقات نے فطری ترتیب کو الٹ دیا ہے۔ جامعات اس بے ترتیبی کو درست کرنے میں بڑی مدد دے سکتی ہیں، لیکن یہ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جامعات کو نظامِ تعلیمی کی ملکی ضرورتوں کے لحاظ سے اصلاح نظرِ ثانی اور اقتدار میں وہ حصہ حاصل ہو جائے جس کی وہ مستحق ہیں۔ اس کو سن کر فوراً یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ "یہ کام جامعہ کا نہیں ہے" بے شک یہ کام بہ حالاتِ موجودہ جامعہ کا نہیں سمجھا جاتا اور میرا کہنا یہ ہے کہ یہ کام جامعہ سے متعلق ہونا چاہیئے۔

جامعہ کو چاہیئے کہ وہ اِس ملک یا صوبہ کا جہاں وہ اپنا کام انجام دے رہی ہے اپنے آپ کو بہ منزلہ اِس دماغ کے بنالے جو وہاں کے تعلیمی مسائل کو سوچے اور وہاں کے تعلیمی نظام کو چلائے۔ ان تعلیمی مسائل کو ٹھنڈے دل اور بے لاگ استدلال سے سوچے جن پر غور و فکر کے لئے حکومت کے اربابِ حل و عقد بوجہ کثرتِ کار وقت نہیں دے سکتے۔ اور سیاسی فرقوں کے ارباب کو کبھی ان دقتوں کا سامنا نہیں ہوتا اور پبلک (عامۃ الناس) کبھی ان کی اہمیت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ آپ کے ذہن میں جامعہ کا تصوّر یہ ہے کہ جامعہ ایک امتحانی جماعت اور کسی حد تک تدریسی جماعت ہے۔ اس جماعت کا فریضہ یہ ہے کہ ایک روزمرّہ کی اجیرن سی کہانی کا سمجھا بوجھا انجام ٹیم ٹام سے فراہم کردے فوقانی نظام کے گھڑے گھڑائے طلبہ پر بی، اسے کا چھاپہ لگا دیتی ہے۔ جس طرح بحری کے شربتوں کی بوتلوں کے بھرنے اور کاگ لگانے کے بعد جانچ پڑتال کر کے مہر لگا دی جاتی ہے مجھے توی توقع ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جامعہ ایک سوچنے والی تحقیقاتی

اور حکمران جماعت ــــــ یعنی ایک ایسا جسد بن جائے جو اپنا نفس اور ارادہ علیحدہ رکھتا ہو۔ اس جماعت کا نفس اور ارادہ ہمارے نفوس اور ارادوں سے بالاتر ہوگا۔ اس لئے کہ ایسی جماعت کے نفس میں علمی گہرائی اور اس کے ارادہ میں زیادہ بے لاگ فیصلہ کی صلاحیت ہوگی، اور اس طرح ایسی جماعت تعلیم کے معیار کو بہت اونچا کر دے گی۔ اور اس اونچان پر سے اس معیار کو گرنے نہ دے گی۔

نظام تعلیمی کی نظر ثانی

یونی ورسٹی کو اپنے میدان تعلیمی کے دماغ کی حیثیت سے جو پہلا کام کرنا ہوگا وہ میں نے جو جامعہ کے فرائض کا تصور بیان کیا ہے اس کے مطابق یہ ہے کہ جامعہ تعلیم کی جملہ منزلوں کے لئے ایک حاوی اور مکمل نظام سوچے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بالفعل تعلیم کی تین منزلیں قرار دی گئی ہیں تحتانی۔ ثانوی (جس میں وسطانی اور فوقانی مدارس شمار کئے جاتے ہیں) اور جامعی۔ ہر منزل کا مدعا یہ ہے کہ آئندہ منزلوں کے لئے طلبہ کو تیار کیا جائے اور جب تیاری مکمل ہو جائے تو آگے کی منزل کا پروانہ طلبہ کو دیا جائے یہ منزلیں اس طرح قائم نہیں کی گئی ہیں کہ ہر منزل بطور خود کافی ہو اور کسی خاص تعلیمی مقصد کو پورا کر دے۔ اس لئے کہ میں یہ سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان تین منزلوں کی بجائے تعلیم کی تین جداگانہ شقیں قرار دی جائیں۔ ہر شق بذات خود کافی و وافی ہو اور ایک واضح مقصود کے پیش نظر ہر شق کے انتظامی کل پرزے ایسے موزوں بٹھائے جائیں کہ مقصود اپنے آپ حاصل ہو جائے۔

(۱) ناگزیر نصاب۔ مثال کی طور پر تحتانی منزل کو لی جئے۔ اس منزل کا منشا یہ ہے کہ متبیئر کم سن

بچوں کی ابتدائی درس و تدریس ہو جائے۔ اس منزل کا موجودہ نظام کے تحت ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ اس منزل سے فارغ ہو کر بچے اس قابل ہو جائیں کہ مردم شماری کے وقت ان کا لکھے پڑھوں میں شمار کیا جائے اس سے بڑھ کر اگر کوئی مقصد ہے تو یہ کہ بچے اس کے بعد کی منزل ــــ ثانوی منزل ــ میں قدم رکھنے کے اہل ہو جائیں جس کے معنی یہ ہیں کہ تحتانی منزل اس راستہ کا ایک حصہ ہے۔ جس کے اس سرے پر پہونچ کر یہ بچے سند یافتہ کلرک بن سکیں گے۔ اس کے علاوہ تحتانی تعلیم کا بہ حیثیت تحتانی تعلیم کوئی مقصود ہی نہیں ہے۔ اس بات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد کہ تحتانی مدرسوں میں پڑھنے والوں میں سے اکثر پڑھائی سے فارغ ہو کر دیہات میں پیشے اختیار کرتے ہیں یہ سوال بے جا نہیں کہ کیا تحتانی تعلیم کو ان بچوں کے لئے جو اسے حاصل کرتے ہیں زیادہ موزوں نہیں بنایا جا سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کو اپنی زندگی گذارنے کے لئے بہتر ذہنی ساز و سامان مل جائے۔ حضرات! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی اور سب سے اہم تعلیمی منزل میں ان جملہ مضامین کی تعلیم دی جانی چاہئے جو بہ لحاظ اہمیت اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں ــــ ایسے مضامین جن کا جاننا دَولت (اسٹیٹ) کے ہر شہری (سٹی زن) کے لئے کار آمد ہے۔ خواہ وہ شہری مرد ہو یا عورت اور خواہ اس کا پیشہ کچھ ہی ہو۔ اور جو ہر شخص کو بہتر شہری اور اس کے کام کو زیادہ مفید بنا دیں۔ ان مضامین اور ان کی تعلیم کو میں ناگزیر نصاب یا تعلیم کہنا بہتر سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے ناگزیر مضامین میں بہت سے ایسے مضامین بھی شامل ہوں گے۔ جن کی تعلیم اب وسطانی (مڈل) مدارس میں دی جاتی ہے۔ نہیں کچھ حصہ اُن مضامین کا بھی ان میں آجائے گا جو فی الحال فوقانی (ہائی) مدارس سے متعلق ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا یقین ہے کہ تحتانی تعلیم میں اس وسیع نصاب کا بندوبست ہو سکتا ہے لیکن ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ

تحتانی تعلیم دیسی زبان میں دی جائے اور ان مضامین کے مطابق اس زبان میں مناسب درسی کتابیں (ریڈریں وغیرہ) تیار کرالی جائیں اور ہر تحتانی مدرسہ میں موزوں کتابوں کے کتب خانے قایم کر دئے جائیں۔ صرف یہی کافی نہو گا۔ اس بات کی بھی اٹل ضرورت ہے کہ ایسے ناگزیر مضامین کے مطابق جو مدرسے درس دیتے ہوں۔ ان میں درس تدریس محض ادبی یعنی کتابی نہ ہو بلکہ ان مدرسوں کی تعلیم کا ایک عملی رُخ بھی ہو جس میں دیہاتی مدارس کی صورت میں زراعت، باغبانی، اور گھریلو صنعتوں اور شہری مدارس میں فنون لطیفہ اور پیشوں کی تعلیم دی جائے۔ حیدرآباد میں اس قسم کا ایک تجربہ کیا جا رہا ہے اور اس تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جو لڑکے اپنی تعلیم کا ایک حصہ اس طرح کسی پیشہ میں دست گاہ حاصل کرنے کے لئے صرف کرتے ہیں وہ اسی مدت میں جو مجموعی نصاب تعلیمی کے تحت اور لڑکوں کو تحتانی اور فوقانی منزلوں میں گذارنی پڑتی ہے کس قدر زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔

(ب) پیشہ وری فوقانیہ مدارس۔ اس طرح کے ضروری نصاب کو ختم کرکے لڑکا یا تو تعلیم ہی کو خیرباد کہے گا۔ اور زراعت یا کسی اور پیشہ میں لگ جائے گا۔ کیوں کہ جو تحتانی تعلیم اس طرح تنظیم پائے گی وہ اس کے لئے کافی پیشہ وری کی تعلیم سمجھی جانی چاہئے یا لڑکا یہ کرے گا کہ وہ جس پیشہ کی فکر میں ہے اسی پیشہ کا خاص تعلیمی نصاب لینا چاہے گا۔ اس خاص تعلیمی نصاب سے فارغ ہوکر اسے اختیار ہو گا کہ جامعہ کی تعلیم سے کنارہ کرے یا کسی جامعہ کے نصاب کو اختیار کرے۔

جس طرح میں نے ابھی اس پر زور دیا ہے کہ تعلیم کی پہلی منزل کو ایک مکمل تربیت کی صورت ان لڑکوں کے لئے دی جائے جو مدرسۂ تحتانیہ سے آگے نہیں بڑھنا چاہتے

یہ نصاب اچھی طرح سوچ سمجھ کر قرار دیا جائے اور اس کے اختتام پر طالب علم ایک خاص مقصود کے لئے تیار ہو جائے یہ نہ ہو کہ مدرسہ تحتانیہ سے نکلنے کے بعد لڑکے کی حالت سے یہ معلوم ہو کہ اس نے گویا ایک راستہ ادھورا طے کر کے چھوڑ دیا اور ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں کسی بات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ غرض ان امور کے مدنظر میں اس کو مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس امر پر غور کیا جائے کہ دوسری منزل کو کہاں تک ایسا بنایا جا سکتا ہے کہ اس سے ان مقاصد اور ضرورتوں کی تکمیل ہو جائے جن کے لئے مزید تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے میرا مشورہ یہ ہے کہ جب یہ ناگزیر نصاب کی تکمیل کر لی جائے تو لڑکے مدارس فوقانیہ میں داخل ہوں۔ ہر مدرسہ فوقانیہ کا مقصد یہ ہو کہ ایک خاص پیشہ کی تربیت جہاں تک ہو سکے کافی اور مکمل دے مثلاً ایک لڑکا فنون لطیفہ میں ماہر ہونا چاہتا ہے یہ لڑکا ناگزیر نصاب تحتانیہ کو ختم کر کے مدرسہ فنون لطیفہ میں داخل ہو جائے گا۔ انجنیری کا شوقین مدرسہ انجنیری، طب کا طالب مدرسہ طبیہ وغیرہ میں تعلیم پائے گا۔ ان مدارس فوقانیہ سے بھی جو طلبہ اپنے فن میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے ان کا احتیاط سے انتخاب کیا جائے گا اور وہ جامعہ کے احاطہ میں قدم رکھیں گے۔ سرکاری ملازمت کی تیاری بھی قانون یا طب کی طرح ایک پیشہ کی تربیت سمجھی جائے گی اور اس تربیت کے لئے بھی خاص درس گاہیں ہوں گی ان پیشہ وری مدارس کا انتظام تو جامعہ نہیں کرے گی۔ لیکن ان کی نگرانی جامعہ کے سپرد کی جائے گی اس قسم کی نگرانی کے لئے جامعہ کو دو ضروری فرائض میری رائے میں مجبوراً انجام دینے ہوں گے۔ پہلا فرض تو یہ ہوگا کہ جامعہ مسلسل تحقیقات کرے اور مواد فراہم کرے جس سے ان مختلف پیشہ لوگوں کی تعداد معلوم ہو سکے جن کی ضرورت حکومت، ریلوے کمپنیوں، پبلک، اور خانگی دفاتر

اور کارخانوں کو ہوگی اور اس بات کی نگہداشت کرے کہ ان پیشوں کے مدارس میں ضرورت سے بہت زیادہ تعداد تعلیم کی غرض سے شریک نہ ہو سکے ان اعداد شمار کی فراہمی جامعہ کے لئے ایک بالکل نیا مسئلہ ہوگا اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ ایک دقت طلب کام ثابت ہو۔ لیکن تجربہ اور رفتہ رفتہ ہر سال کے اعداد کے اکٹھا ہو جانے کے بعد جامعہ ملک کی ضرورتوں کا قریب قریب صحیح اندازہ کر سکے گی۔ دوسرا ناگزیر فریضہ جامعہ کا یہ ہوگا کہ ان مدارس میں جو تعلیم دی جائے گی اس کی نوعیت نصاب اور مدت کا تعین اس لحاظ سے کرے کہ ملک کی ضرورتوں کے مطابق مختلف پیشوں اور کاموں کے لئے آدمی تربیت پا جائیں۔

میں نے ان مدارس میں سوچ سمجھ کر طبی، انجنیری اور قانون کے مدارس کو شامل کیا ہے۔ کیوں کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان پیشوں کی تعلیم کو طلبہ کی بہت آگے کی منزل سے متعلق کیا گیا ہے اور اس سے یہ قباحت پیدا ہو گئی ہے کہ ان پیشوں کی تربیت اور تعلیم کا صرفہ بہت زیادہ ہو گیا ہے اور اس اخراجات کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمارے ہاں جو ڈاکٹر، انجنیر، وکیل، اور زراعت دان ہیں وہ اپنی تعلیم کی مناسبت سے بہت اونچے معاوضہ کے متوقع ہیں۔ خواہ وہ سرکاری ملازمت میں آنا چاہیں خواہ پبلک طور پر اپنا پیشہ کریں اور اتنا زیادہ معاوضہ ہمارا ملک دے نہیں سکتا۔ ہوا یہ ہے کہ بے ضرورت حد تک ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھا دی گئی جن کو ان کی طویل اور قیمتی تعلیم کی مناسبت سے گذارے کے قابل معاوضہ نہیں مل سکتا اور لطف یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیمی نے ان ضروری پیشوں میں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے ایسے کافی تربیت یافتہ لوگ پیدا نہیں کئے جن کے تعلیمی مصارف کم ہوتے

اور جو واجبی معاوضہ پر ملک کی خدمت کر سکتے۔ ایک واقعی مثال ڈاکٹروں کی لی جیئے
ہندوستان کو ڈاکٹروں اور صحت افسروں کی بڑی تعداد کی ضرورت ہے۔ جو ملک کے
دور دراز حصوں تک میں پہونچ جائیں اب ہوتا گیا ہے کہ ہمارے طبی طلبہ ایک سخت
نصاب کی تعلیم اٹھارہ برس حاصل کرنے کے بعد کہیں مطب کرنے کے اہل سمجھے جاتے
ہیں، اور یہ مدت بھی یہ فرض کر کے رکھی گئی ہے کہ طالب علم مختلف سالانہ امتحانات میں
سے مسلسل کامیابی کے ساتھ نکلتے جائیں کیا اس طرح کا انتظام ممکن نہیں کہ حسب ضرورت
تعداد ایسے ڈاکٹروں کی جو معمولی دکھ بیماریوں میں دکھ سے نجات دے سکیں۔ ایک
ایسے نصاب کے تحت تیار کی جائے جس میں بجائے کم سے کم اٹھارہ سال کے زیادہ
سے زیادہ چودہ سال کی تعلیم کافی ہو۔ چودہ سال بھی اس طرح کہ سات سال ابتدائی
ناگزیر اور سات سال بعد کے پیشہ وری کے نصاب میں صرف ہوں، آپ ناواقف
نہیں کہ سرکاری سررشتۂ طبیہ میں تین طرح کے ڈاکٹر ہوتے ہیں سب اسسٹنٹ، اسسٹنٹ
اور سول سرجن۔ میں نے یہ بات پائی —— کم سے کم حیدرآباد دکن میں۔ کہ جن لوگوں
نے ایسی طبی تعلیم پائی ہے۔ جس کی مدت میں نے ابھی اٹھارہ سال بیان کی ہے۔ یعنی
جنہوں نے جامعہ کی طبی سند حاصل کی ہے۔ یہ لوگ اسسٹنٹ سرجن ہوتے ہیں اور ان کی
تعداد ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے، اور ایسے طلبہ کی تعداد جو سب اسسٹنٹ سرجن
کی سند کی کوشش کریں اس تعداد سے کہیں کم ہے، جس کی واقعی مانگ ہے۔ انجینیری میں بھی
یہی حال ہے اس فن کی جامعہ کی سندیں جن لوگوں نے حاصل کی ہیں وہ گویا انجینیری کی اعلیٰ
شاخوں کے لئے تیار ہوئے ہیں۔ وہ ایسی سرکاری ملازمت یا خانگی کام کے لئے شوق
سے آمادہ ہیں جس کے لئے زیادہ مختصر اور کم خرچ تربیت جیسی کہ سوپروائزروں اور

اور سی روں کو دی جاتی ہے کافی ہوتی۔

میں اب جس مشورہ کے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جامعہ اس بات کی تحقیق کرے کہ کتنے آدمی اور کن اصولوں کے تحت کس قسم کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر ملک کے ان ضروری شعبوں میں خدمتوں کو سرانجام دے سکیں گے۔ جامعہ کو اس بات کا بھی خیال کرنا ہوگا کہ جتنی تعداد کو تعلیم دینی ہے اسی حد تک ان کی تعلیم کا معقول اور کافی ووافی انتظام کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ بچ رہیں گے وہ خواہ مخواہ ان مدرسوں میں ہجوم نہیں کریں گے اور اپنا روپیہ بے سود صرف نہ کرنے پائیں گے۔ وہ لوگ ناگزیر تعلیم سے استفادہ کر کے تعلیمی میدان میں آگے نہیں رہیں گے بلکہ اپنے اپنے پیشوں میں لگ جائیں گے اور سوسائٹی کے دولت پیدا کرنے والے کماؤ افراد بن جائیں گے۔

جامعہ کو یہ بھی یاد رکھنا پڑے گا کہ جو لوگ پیشہ وری کے مدرسوں میں تعلیم پائیں وہ تعلیم سے فراغت پا کر جو نکلیں تو ان کے لئے ایسے کام موجود ہوں جن سے وہ اپنی حسب لیاقت روپیہ کما سکیں اور ایسا نہ ہو کہ ان سے اوپر والی منزل کے لوگ اپنی تعداد کی زیادتی کے باعث ان بیچاروں کے میدان میں آن کودیں اور ان کو کہیں کا نہ رکھیں میں پھر اس کو دہرانا چاہتا ہوں کہ پہلے پہل تو اس طرح جو اعداد فراہم ہوں گے وہ صحت سے بہت دور ہوں گے اور اس غیر صحیح تعداد کے لئے انتظام کیا جائے گا وہ ان معنوں میں ناقص ہوگا کہ صحیح تعداد وہاں سے تعلیم پا کر نہ نکل سکے گی۔ لیکن رفتہ رفتہ جامعہ کو صحیح تعداد کا اندازہ ہوتا جائے گا اور ساتھ ہی اس کو صحیح تعلیمی معیار کا بھی پتہ مل جائے گا۔ یہ سب باتیں اسی وقت ظہور میں آسکیں گی کہ پہلے اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ ان امور کو بھی لازمی طور پر مادر علمی کے احاطۂ اقتدار میں آجانا چاہئے میں یہ پوچھتا ہوں کہ ایسا کیوں

نہ ہو؟ کیا اب جامعات اس پر روز بروز مجبور نہیں ہیں کہ اپنے فارغ التحصیل لوگوں کے لئے فراہمی ملازمت کے بورڈ (دفتر) قائم کریں میں نے جو کچھ کہا وہ اسی مسئلہ کے حل کے متعلق ایک مشورہ ہے۔

(ج) جامعی منزل۔ اب میں تیسری اور سب سے اونچی تعلیم جامعہ کی تعلیم کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جب طلبہ فوقانیہ مدرسوں سے فراغت پائیں گے تو ان کو جامعہ اپنے زیرِ عاطفت لے لے گی۔ ان طلبہ کو کوڑے کرکٹ کی طرح علیحدہ کر دے گی جن کی حالت ناکافی یا ناپسندیدہ ثابت ہوئی ہو۔ اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہونگے کہ جامعہ طلبہ کی ایک محدود اور منتخب تعداد کی درس تدریس راست اپنے ذمہ لے گی اس تعداد کو خود طلبہ کی قابلیت اور جامعہ کے نصاب کو پورا کرنے کا رجحان اور ملک کی ضرورتوں کے لحاظ سے جتنی تعداد ہونی چاہئے یہ امور جامعہ کے طلبہ کی تعداد کو محدود کریں گے۔ میں جن باتوں کو جامعہ کی ادنیٰ سرگرمیوں سے موسوم کرتا ہوں وہ کم ہو جائیں گی اور ان کی پیچیدگیوں سے نجات مل جائے گی اور جامعہ کو موقع ملے گا۔ کہ اپنی اعلیٰ سرگرمیوں میں آزادی کے ساتھ منہمک ہو جائے یہ اعلیٰ سرگرمیاں میری رائے میں یہ ہیں تحقیق (ری سرچ) اور خصوصی مہارت۔ اس کے علاوہ متمدنہ ممالک میں بعض اوقات تعلیمی اور تعلیم سے گتھے ہوئے چند مسائل بعض سیاسی مسائل کی طرح شدید اور نازک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جامعہ کا یہ بھی فرض ہو گا کہ ایسے مسائل کی دریافت کرے اور غور و فکر کے بعد ان کا حل پیش کرے۔ جامعہ اس بارے میں بہترین کام کر سکتی ہے اس لئے کہ جامعہ کی فضا میں سکون اور وہاں کا فیصلہ بے لاگ ہو گا۔ اور ان لوگوں کا فیصلہ ہو گا جو صاحب علم و فضل ہوں گے۔ ایسی فضا میں جہاں نسلی، ملّی (کمیونل)

دفتر شاہی (بورڈکراکٹ) یا سیاسی زہر دوڑا ہوا ہو ان مسائل کا حل کبھی بہترین طور پر نہیں ہو سکتا۔

میں نے جامعہ کے ایک تدریسی فرض کو ایک گنی گنائی تعداد کے لئے محدود کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ لیکن اس محدود تعداد میں میں نے ان لوگوں کو بھی شامل رکھا ہے جو سرکاری خدمتوں اور اعلیٰ پیشوں میں خالی جگہوں کو پُر کریں گے۔ اعلیٰ پیشوں کی جگہوں کے لئے جامعہ کے مختلف شعبے اب بھی فارغ التحصیل آدمی تیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ ایک اور قسم کے طلبہ بھی۔ میں نے جامعہ کی محدود تعداد میں داخل کئے ہیں۔ وہ وہ طلبہ ہیں جن پر جامعہ کی ساری توتیں صرف ہوں گی یعنی وہ علم کے رسیا جو علم کو خاص علم کی غرض سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر جامعہ کو علم و فضل اور تحقیق کا دوامی گھر اور بے لاگ رائے کا مرکز بننا مقصود ہے تو اس قسم کے طالب علم جامعہ کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ کیوں کہ ایسے ہی طلبہ جامعہ کی زندگی کی جان ہوتے ہیں۔ اور یہی اس کی اعلیٰ سرگرمیوں کی آگ کو روشن رکھتے ہیں۔ ان سرگرمیوں کو دوسروں تک پہونچا کر ان کا تسلسل قائم کرتے اور ان کو چار چاند لگاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ علم کی اس روشنی کے رکھوالے ہوتے ہیں جس کو "زرتشت نے اپنی پرستش کے چبوترے" اور "گلی لیو" نے اپنے رسدی گنبد میں جانا پہچانا تھا" اور جس روشنی کو اب بھی اس تاریکی کو اُجالا بنانا ہے جو ہمیں چوطرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

جس اسکیم کا سایہ کی طرح دُھندلا خاکہ میں نے ابھی پیش کیا ہے جس سے ابتدائی یا جیسا کہ میں نے اس لفظ کو ترجیح دی ہے ناگزیر تعلیم کی تکمیل ہوگی، اور جس میں سے گزرنے کے بعد طلبہ کی بیشتر تعداد مدرسہ کو چھوڑ کر کھیت، دوکان، یا کارخانہ میں کام پر جانے لگے گی اور یہی لوگ بہ لحاظ کثرتِ قوم کے لشکر کے سپاہی ہوتے ہیں ـــ اس اسکیم سے میرا منشا ہر

کہ ان نوجوانوں کے تعلیمی اخراجات کی کفایت ہو جائے گی جو کسی نہ کسی طرح مدرسوں میں سے گزر کر سرکاری ملازمت کی تلاش میں سرگرداں، اس افسوس ناک بھیڑ کو بڑھاتے ہیں جس کو تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی فوج کہا جا سکتا ہے۔ ان میں ان بدنصیبوں کا شمار نہیں ہے جو تحصیلی سند (ڈگری) کے لینے یا میٹرک یا اس سے بھی ابتدائی تعلیمی مرحلوں ہی میں ناکامیاب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سب نہ صرف پبلک بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم خانگی اخراجات کے نقطۂ نظر سے روپیہ، پیسہ، وقت اور قوت کے کورے قومی خسارے کے جیتے جاگتے اعداد ہوتے ہیں اور یہ سب روپیہ پیسہ بعض ایسی صورتوں میں بھی صرف کیا جاتا ہے کہ والدین دراصل اتنے اخراجات کی سکت نہیں رکھتے اس امر واقعی کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قوم کے اکثر و بیشتر نوجوان ناگزیر تعلیم کو ختم کر کے سرکاری ملازمت اور دیگر پیشوں کی جانب رُخ کرنے سے باز رہیں گے جن کی طرف آج کل لوگ اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جیسا کہ لوگ اس مشہور سونے ـــــ مگر افسوس ہے کہ محض قصہ کہانی کے درخت پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ غرض ناگزیر تعلیم سے فارغ ہو کر یہ نوجوان فطری طور پر زراعت صنعتوں اور حرفوں کارخانوں اور تجارت میں ہل چل ڈال دیں گے، کیوں کہ وہ ان راستوں پر اپنی ساری ذہانت اور قوت کو صرف کرنے لگیں گے جو بحالات موجودہ ایک محض خیالی، اقتصادی، اور سماجی ڈھکوسلہ کے پیچھے ضائع ہو جاتی ہے۔

میری التجا ہے کہ میری ان باتوں کے متعلق اپنے دل میں کسی غلط فہمی کو پیدا نہ ہونے دیجئے۔ میری تجویز رجعت قہقری کی نہیں ہے۔ اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ تعلیم میں روڑے اٹکائیں جائیں اور اسے پھیلنے سے روکا جائے۔ میرا منشا اس کے بالکل برعکس ہے میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آبادی کے بڑے حصے میں معیار تعلیمی یکساں ہو جائے لیکن ساتھ

ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ موجودہ اعلیٰ ثانوی اور کالج کی منزلوں میں سینکڑوں ناکامیابیوں سے جو مصیبت اور پریشانی پھیلتی ہے وہ باقی نہ رہے میری آرزو یہ ہے کہ اس طرح جو ذرائع تعلیمی بچ جائیں ان سے سب سے پہلے تو عامتہ الناس کی ناگزیر تعلیم کی اصلاح اور بعد میں پیشہ وری اور حرفتی تعلیم و تربیت کے انتظام میں کام لیا جائے تاکہ ملک کی ضرورتوں کے مطابق تعداد کی تعلیم فوقانی مدارس میں ہو سکے اور سب سے آخر میں جامعہ کی منزل میں بہترین ساز و سامان چند منتخب دماغوں کے لئے جو اپنی موزونیت کا ثبوت دے چکے ہوں فراہم کیا جائے۔

یہ امور محض مشورہ کے طور پر ہیں اور جن کو میں نے بہت کچھ ہچکچاتے ہوئے نہایت خاکساری کے ساتھ پیش کیا ہے منشا یہ ہے کہ اس پیچیدہ اور اٹل تعلیمی مسئلہ پر بحث مباحثہ کی تشویق اور چھیڑ چھاڑ ہو۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ ہمارے موجودہ نظام تعلیمی پر بہ لحاظ تفصیلی نظم و نسق دونوں پہلوؤں سے جیسا کہ "بےکن" نے کہا ہے قبیلہ کے بت' سوار ہیں اور یہ وہی بت ہیں۔ جن کی حکمرانی انگلستانی تاریخ کے مختلف تعلیمی اور سیاسی زمانوں میں رہی ہے۔ ہوا یہ کہ گذشتہ صدی میں جو ماہرین فن تعلیم ہندوستان' آتے تھے وہ انہیں باتوں کو اپنے اصول اور مسلمات کی حیثیت سے ساتھ لاتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ان خاص خیالات کی ہمارے موجودہ نظام تعلیمی میں پرورش اور نگہداشت ہوتی رہی یہاں تک کہ بہت سے امور اور خیالات پتھر کی لکیروں کی طرح راسخ ہو گئے۔ ان باتوں کے اثر سے ہماری جدید جامعہ کی اصلاح کے بحث مباحثے متاثر ہوتے ہیں۔ اور بعض موجودہ نظام کی داخلی خرابیوں کو محسوس کرنے اور ان سے نجات پانے سے باز رکھتے ہیں شدید ضرورت

ہے کہ ایک وسیع النظر نقطے سے بال کی کھال کھینچنے والی تحقیقات اس مسئلہ کے متعلق کی جائے اور اس تحقیقات پر مروجہ خیالات کی بیڑیاں نہ ڈالی جائیں۔ تعلیمی مسئلہ بے انتہا اہم ہے۔ ہر سال طرح طرح کی بہت سی کانفرنسیں قائم کی جاتی ہیں لیکن میں اس کو زیادہ ترجیح دوں گا کہ ایک شاہی کمیشن تشکیل دی جائے۔ جس کے ارکان بہ لحاظ قابلیت زوردار ہوں اور وہ ہندوستانی تعلیم کو ہر پہلو سے مطالعہ کرے۔ اس کمیشن کا میدان مطالعہ کسی ایک جامعہ یا کسی خاص منزل تک ہی محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ کل ہندوستانی تعلیم کے میدان پر حاوی ہو۔ کلکتہ کمیشن کی طرح اس میں یورپی ممتاز ماہرین تعلیم کا عنصر ضروری ہوگا اور ساتھ ہی ہندوستان میں اس وقت جو لوگ طرح طرح کی رائے اور خیال کے حامی ہیں ان میں سے بھی ارکان کا انتخاب کیا جائے اس طرح کے عنصروں سے جو کمیشن صورت پذیر ہوگی اس کی متفقہ سفارشات اس قابل ہوں گی کہ ان کو لوگ عام طور پر تسلیم کرلیں۔ اگر اس کی تجویز متفقہ نہ بھی ہوں تو بھی یہ بات کھل جائے گی کہ وہ امور کیا ہیں جن پر مستند ارباب اختلاف رائے رکھتے ہیں اور اس طرح اس کمیشن کی رپورٹ ہندوستان کے ارباب تعلیم اور حکمران دونوں کے لئے ایک انمول رہبر کا کام دے گی۔ اس کمیشن کے احاطہ تحقیقات میں وہ مسائل بھی داخل ہوں گے جن کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے اور اس خطبہ کے دوران میں آگے چل کر توجہ دلاؤں گا۔

ذریعہ تعلیم۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ میری رائے میں موجودہ طریق تعلیم میں وہ کونسی چیز ہے جو خرابی اور کمزوری کی جڑ ہے تو میں بلا تامل یہ کہوں گا کہ وہ چیز یہ ہے کہ درس تدریس میں مادری زبان کو چھوڑ کر بیشتر پرائی زبان سے تفہیم کا کام لیا جاتا ہے۔ پرائی زبان سے میں یہ مراد لیتا ہوں کہ

وہ زبان جو لڑکے کی مادری زبان نہ ہو۔ اس کے سوا میں اور کسی خیال کو پرائی کے مفہوم میں شامل نہیں کرتا۔ پرائی زبان میں قدرت کا حاصل کرنا۔ اس بات کو ہندوستان کے نوجوانوں کے سامنے نصب العین کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اور اسی کو تعلیم یافتہ ہونے کی علامت گردانا گیا ہے۔ پرائی زبان میں درس تدریس کے ہونے سے ذہنی قوت کی تضیع ہوتی ہے اور طلبہ کے نفوس پر دہرا بار پڑتا ہے۔ یہ بار لڑکوں کے نفس پر اس زمانہ میں پڑتا ہے جب کہ ان کا سن و سال اثرات کو آسانی سے قبول کرتا ہے اس زمانہ سے نکلنے کے بعد پھر لڑکے اس آسانی اور شوق سے تعلیم نہیں پا سکتے اس لئے اس چیز کو قبول کرنے کی بہار کا زمانہ نکل جاتا ہے۔ اور عین اسی زمانہ میں ہمارا انتظام تعلیمی طلبہ کے دماغ اور علم کے درمیان پرائی زبان کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی پرائی زبان میں طلبہ کو ایک حد تک مہارت ہو بھی جائے تو اتنی مہارت اس بات کی ضامن نہیں ہو سکتی کہ اس زبان میں جن باتوں کی تفہیم کی جائے گی طلبہ ان خیالات کو صحیح صحیح سمجھ لیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ پرائی زبان میں جن لوگوں تک خیالات پہونچائے جائیں وہ کبھی ان خیالات کو اسی طرح نہیں سمجھ سکتے جس طرح انہیں خیالات کو وہ اپنی زبان میں سمجھ لیتے کم سے کم یہ مان لینا پڑتا ہے کہ پرائی زبان میں مادری زبان کی سی سہولت خیالات کے سمجھنے میں نہیں ہو سکتی اور اس واقعہ کی گواہ وہ سخت محنت ہے جو پرائی زبان کے حاصل کرنے میں اٹھانی پڑتی ہے۔ اور یہ ایک ایسا امر واقعی ہے جو پرائی زبان کی دقت کو بلا کسی استدلال کے واضح کر دیتا ہے۔ جب ایسے لوگوں کی بولی کو جن کے قومی رجحانات اور خصائص یا ایک لفظ میں یوں کہئے جن کی 'جی نی' اس ہماری 'جی نی' اس سے اس قدر جداگانہ ہے۔ ذریعۂ تدریس بنایا جائے تو معمولی

طالب علم کے دماغ میں روڑے سے اٹکا دئے جاتے ہیں اور تیز ذہن والے لڑکے اسے ایک دل لگی سی سمجھتے ہیں۔ ذہین لڑکا پرائی زبان پر قابو پانے کی کوشش ناٹک بھاؤ کے ساتھ کرتا ہے۔ اس طرح کی تعلیم کو نہ تو علم وفضل سے سروکار ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا تعلق ملک کی ضرورتوں سے ہوتا ہے۔ پرائی زبان کو لڑکا اس طرح سیکھتا ہے جس طرح ایکٹرا اپنے اپنے پارٹ یاد کرتے ہیں لڑکا اپنی قومی ذہنیت سے علحدہ ہو کر ایک اجنبی ذہنیت اختیار کرتا ہے اور اس طرح اپنے فطری جوہروں اور جی نی اس کو ماند کر دیتا ہے۔ اور اس مضمون کی اہمیت کو جو پرائی زبان کے ذریعہ سمجھایا جاتا ہے نسبتًا وہ وقعت نہیں دے سکتا جو دینی چاہئے۔ غرض کوئی طالب علم اپنی ذہنیت کی جیتی جاگتی فضا اپنے خیالات اور حسیات کو پرائی زبان میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس ابتدائی اہم ترین زمانے میں لڑکے کی سوچ بچار پر ایک ایسی زبان کا بوجھ لادنا جس پر اس کو قابو نہیں اور جس زبان میں پردیسی ذہنیت رچی ہوئی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خیال اور راداۓ خیال میں جو نازک مناسبت ہے اس کا پیدا ہونا ناممکن ہو جائے حالانکہ اسی مناسبت پر دماغی سوچ بچار کا انحصار ہے۔ ایسے پرائے ذریعۂ تعلیم کا قابل افسوس نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ خیالات اور اداۓ خیالات میں کڈھپ پن اور بھونڈ پن پیدا ہو جائے۔

جامعہ عثمانیہ

آپ حضرات نے یقینًا جامعہ عثمانیہ کی بابتہ کچھ نہ کچھ بہ سبیل افواہ ہی ضرور سنا ہوگا۔ یہ ایک زبردست تجربہ ہے جو حیدرآباد میں اعلیحضرت اقدس واعلیٰ کی بیدار مغزانہ سرپرستی میں کیا گیا ہے اس یونی ورسٹی میں انگریزی زبان کو ایک لازمی زبان ثانی کی حیثیت دی گئی ہے

اور یہی اُس زبان کی ہندوستانی طلبہ کے لحاظ سے صحیح حیثیت ہمارے نصابِ تعلیمی میں ہو سکتی ہے۔ میں یہ کسی طرح نہیں چاہتا کہ آپ یہ خیال کریں کہ ہم نے انگریزی زبان کو جو یہ حیثیت دی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم حیدر آباد میں زبانِ انگریزی یا جدید تعلیم کے مخالف ہیں بات یہ ہے کہ ہم لوگوں نے بقیہ ہندوستان سے کچھ ـــ کچھ یوں ہی سا ـــ پہلے اس بات کو محسوس کر لیا کہ انگریزی تعلیم کا جو احسان ہم پر ہے وہ اور اس کی قدر و قیمت اس بات سے بے اندازہ زیادہ ہو جائے گی کہ اس علم کو جو زبانِ انگریزی سے ہم تک پہونچا ہے ہم اپنی ہی زبان میں حاصل کریں۔ یہ علم ہماری مستقبل کی قومی زندگی اور ترقی کی رُوح رواں ہے اور جب یہ ہماری زبان کے توسط سے آئے گا تو وقت اور ذہنی قوت کی تضیع نہ ہو گی۔ اور خیالات کو اپنا بنانے میں ان کو توڑ مروڑ کر ناقص اور بھونڈا کرنا نہیں پڑے گا ـــ یہی وہ عیب ہیں جو پرانی زبان کے وسیلۂ تدریس ہونے کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ رہتے ہیں۔ یورپ طبعی سائنس کی دوڑ میں ہم سے اس قدر آگے نکل گیا ہے کہ کہ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ سائنس اور دیگر علوم میں ہمیں مدتوں یورپ کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا پڑے گا حیدر آباد میں ہم لوگ اس بات سے اس درجہ باخبر ہیں کہ ہم نے یہ نہیں کیا کہ یورپی علوم کے بندرگاہ سے اپنی علمی کشتی کا لنگر اٹھا لیں بلکہ ہم نے ان علوم پر اپنی پوری توجہ مزید زور کے ساتھ گاڑ دی ہے۔

اُردو میں ان کتابوں کا وجود ہی نہ تھا جو مختلف مضامین کی تدریس کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن ہم اس بات سے مطلق خوف زدہ نہیں ہوئے۔ ہم نے ان کتابوں کو معرضِ وجود میں لانے کی کوشش فوراً شروع کر دی۔ ریاضیات۔ طبعیات۔ کیمیا۔ ارضیات۔ نباتیات حیوانات۔ حیاتیات۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ معاشیات۔ فلاسفی۔ ان سب مضامین میں بی، اے

کے معیار تک کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، اور اب بہت سی کتابیں قانون، طب، اور انجنیری کے شعبوں کے لئے ترجمہ ہو رہی ہیں۔

اس غرض سے کہ طلبہ علم اور خیالات کی جدید ترین پیش قدمیوں سے روشناس رہیں۔ ہم نے اس پر زور دیا ہے کہ ہمارے طلبہ کی انگریزی کا معیار وہی رہے جو ہندوستان کی دیگر جامعات میں معین ہے اور یہ شرط نہ صرف شعبۂ فنون بلکہ ہر شعبہ ــــ دینیات، انجنیری، طب ــ کے ہر طالب علم کے لئے لازمی گردانی گئی ہے۔ انگریزی ادب پر اصرار کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے طلبہ کو ایک اور فائدہ بھی ہو۔ وہ یہ کہ ہر پیشہ کے مضامین کی تعلیم کے ساتھ ایک عام کلچر بھی وابستہ ہو جائے ہماری جامعہ کے امتحانوں میں اندرونی ممتحنوں کے ساتھ بیرونی ممتحن بھی ہمیشہ دوش بدوش رکھے جاتے ہیں اور ان بیرونی ممتحنوں نے ہمارے طلبہ کے سلجھے ہوئے بیان اور مضامین کی گرفت کی تصدیق کی ہے۔ یہ تصدیق قابل غور ہے اور اس سے ہمارے اس تجربہ پر گویا کامیابی کی مُہر ثبت ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس تجربہ میں ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے صرف وہی ایک ایسا راستہ ہے جس سے ہماری مادری زبان وسیع ترین علم، عمیق ترین خیالات، اور بلند ترین احساسات کے ادا کرنے کا قابل قدر وسیلہ بن سکتی ہے۔ اور اس طرح وہ نہایت زبردست ہتھیار گھڑا جا سکتا ہے، جس سے ہمارے عامۃ الناس مردوں اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کا قلعہ مسخر کیا جا سکے گا۔ جامعۂ عثمانیہ جیسے کارنامہ کے غائر مشاہدہ کے بعد جس کا مجھے خوش نصیبی سے موقع ملا۔ آدمی محسوس کر سکتا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستان کی دیسی زبانوں کو مادری زبان کے علاوہ کسی اور

زبان کے وسیلۂ تدریس بنانے سے کتنا نقصان پہونچا ہے ۔ ہر قوم کی طبعی جی نی اس' اور جوہر جدا گانہ ہوتے ہیں اور ان کے لیئے انہیں کی مادری زبان اظہار خیال کا بہترین وسیلہ ہو سکتی ہے ۔ پرائی زبان کے ذریعہ کوئی قوم نوع انسان کے ادبی یا علمی خزانہ میں اضافہ نہیں کر سکتی ۔ جو قوم اپنے خاص جوہروں ۔۔۔ اور جی ئی اس کے مطابق جو اللہ تعالےٰ نے اس کو عطا کی ہے اس طرح اضافہ کرنے میں ناکام رہے تو اس ناکامی سے اس قوم کی صلاحیت اور استعداد کی حد تک خود نوع انسان کو خسارہ اٹھانا پڑتا ہے کیوں کہ نوعِ انسان پہ قرضہ آتا ہے ۔ نوع انسان کا رہتی" دنیا تک" یہی وجہ ہے کہ یہ تجربہ ۔۔ نہیں اب میں اسے تجربہ نہیں ایک زبردست کارنامہ سمجھتا ہوں جو اعلیٰحضرت اقدس اعلیٰ نے جامعۂ عثمانیہ کی صورت میں پیش فرمایا ہے ۔ یہ کارنامہ اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی ماہر تعلیم اس سے ہمدردی اور اس کی تائید کرے ۔

تجدیدی کام

ہندوستان میں جامعات کے کام کا بیشتر تجدیدی ہونا ناگزیر ہے اور اسی حیثیت سے جامعات کا کام اصلی ہوگا اور اس کی قدر و قیمت پائدار ہوگی ۔ سب سے پہلے تو جامعوں کا یہ فریضہ ہے کہ ہندوستانی طلبہ کی ذہنی نظر کو صحیح اور تندرست بنایا جائے ۔ جب تک ہندوستانی جامعات میں وسیلۂ تعلیم پرائی زبان رہی گی خیال اور زادۂ خیال میں کامل مطابقت پیدا نہ ہو گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی طلبہ کی ذہنی نظر صحیح اور سچی نہ ہو سکے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے زبان کے مسٔلہ کو ہندوستانی جامعات کے تجدیدی کام کی غرض سے پہلے رکھا ہے ۔

تاریخ۔ ہماری تاریخ کے اصلی ماخذوں کا باقاعدہ تحقیقی کام ہاتھ میں لینا ضروری ہے
ان ماخذوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور ان میں سے بعض کی صحیح تعبیر اور معنوں کا تعین
صرف ہندوستانی ہی کر سکتے ہیں۔ انسانی علم کے لئے اس تحقیقی کام سے بہت سی نئی
باتیں نکل آئیں گی۔ اور موجودہ درسی کتابوں میں ہندوستانی تاریخ کے مختلف زمانوں
اور ان کے امتیازات کے بارے میں جو باتیں پائی جاتی ہیں ان کی نظر ثانی کرنی
پڑے گی۔ تاریخی درسی کتابوں سے تاریخِ ہند کے متعلق ہمارے طلبہ نفسی نقوش حاصل
کرتے ہیں اور یہ نقوش اس لئے بہت گہرے ہوتے ہیں کہ یہ نفسی نمو کے ابتدائی زمانے
میں دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ بات صحت کے ساتھ دریافت ہوتی
ہے کہ بدھ مت کا جس زمانہ میں ہندوستان میں راج تھا دوسرے مذاہب کے
ساتھ اس کے کیا تعلقات تھے۔ بدھ مت کے عروج کے کیا اسباب تھے۔ اور وہ
کونسی قوتیں تھیں جو اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ کیا بدھ مت نے اپنی تاریخ کے
کسی حصہ میں اور مذہب والوں کے ساتھ سیاسی جبر و تشدد کا برتاؤ کیا جیسی کہ بعد میں
خود اس کو سختیاں جھیلنی پڑیں۔ یہ بھی تحقیق طلب ہے کہ آیا بدھ مت ہندویت کے منجملہ
اور فرقوں کے ایک فرقہ کی حیثیت رکھتا تھا جو پھیلتا گیا اور لوگوں نے اس سے فیاضانہ
رواداری برتی۔ اچھا اب بعد کے ایک تاریخی زمانہ کو لی جئے۔ اس میں یہ امر معلوم
کرنا ہے کہ عربوں، افغانیوں، اور مغلوں کے حملے کہاں تک بدھ مت کے پیروکستانوں
کے حملوں سے ملتے جلتے ہیں؟ یہ حملے مذہبی جوش و خروش کا پھل تھے یا ان کی تہ
میں محض معاشیاتی اسباب تھے جن پر بعد کے مورخوں نے یا خود حملہ آوروں نے ملک گیری
کے جنون کو ڈھانکنے کی غرض سے مذہبی رنگ چڑھا دیا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب

اور ٹیپو سلطان جیسے فرماں روا آیا محض تعصب میں ڈوبے ہوئے تھے یا یہ کہ سیاسی مقاصد ہی ان کے کاموں کے محرک تھے۔ یہ سوال ان تاریخی دستاویزوں کی بنا پر ہوتا ہے جواب ہاتھ لگی ہیں اور شائع کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک عالمگیری فرمان میں بنارس کے مسلمان صوبہ دار کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے صوبہ میں ہندو مندروں کے اوقاف کی احترام اور احتیاط کے ساتھ نگہداشت کرے اور اس بات کا خیال رکھے کہ ہندو رعایا پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی رسوم ادا کرتی رہے۔ دوسری دستاویز میں ٹیپو سلطان کے احکام ہیں۔ ٹیپو سلطان کے والد کے بابت یہ مشہور بات ہے کہ انہوں نے اپنے ہندو آقاؤں کے ساتھ ہمیشہ احترام اور وفاداری کو ملحوظ رکھا۔ ٹیپو سلطان کے احکام یہ تھا کہ برہمن پجاریوں کو دل کھول کر روپیہ دیا جائے اور ان سے استدعا کی جائے کہ وہ دشمنوں پر ٹیپو سلطان کی فتح یابی کے لئے دعا کریں۔ اب جو تاریخیں مروج ہیں ان میں جنوبی ہند نے تاریخ ہند کے دلچسپ فسانہ ہندی کلچر اور ہندو مسلم اتحاد میں جو اضافہ کیا ہے اس کا ذکر کافی طور پر نہیں ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ دکن کے مشہور وزیر محمود گاوان نے ایک سکونتی کالج قائم کیا تھا جس کے آثار اب بھی جنوبی ہند کی تعمیری یادگاروں میں ایک شاندار یادگار ہیں اور یہ کہ اسی محمود گاوان نے کامیابی کے ساتھ عامتہ الناس کی تعلیم کا ایک نظام قائم کیا۔ ملک عنبر ایک سپاہی اور مدبر تھا نظام شاہی عہد میں اس نے مال گزاری میں جو جو اصلاحیں کیں۔ ان سے بھی شاذ و نادر ہی لوگ واقف ہیں حالانکہ ملک عنبر کے نام کی اس طرح شہرت ہونی چاہیے جیسی کہ ٹوڈرمل کی ہے۔ گنتی کے ہندوستانی ایسے ہیں جو وجیا نگر، بہمنی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی تاریخ سے واقف ہیں ان سلطنتوں نے ہندو اور مسلم عنصروں کو کیمیائی ترکیب دی

اور اس شیرازہ بندی سے ایک خیالات سے مالا مال، ادب شاندار عمارات خیر گستر سیاسی ڈھانچ اور روادار نظم ونسق پیدا کیا اور آج کل بھی ان چیزوں کے آثار دکن میں باقی ہیں۔

فنون لطیفہ

میں اس بارے میں جو مثال پیش کرنے والا ہوں وہ بھی مملکت آصفیہ سے ہی لی گئی ہے۔ اجنٹہ کے غاروں کا مسئلہ بھی حل کا طالب ہے۔ غار ہائے اجنٹہ قدیم فنون لطیفہ کا ایک قیمتی خزانہ ہیں۔ اور دنیا کے دور دراز حصوں کے مصوروں کے لئے ایک تیرتھ گاہ ہیں۔ ان غاروں کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ یہ عجیب وغریب اعلیٰ اور مکمل فنِ نقاشی ہماری تاریخ کے ایک خاص زمانے میں پیدا ہوا اور رائج رہا اور بعد نا پیدسا ہو گیا آپ سر جان مارشل سے نا واقف نہیں ہیں۔ دولتِ آصفیہ کے ان اَن مول خزانوں کو زمانہ اور موسم کی دست برد سے مامون رکھنے میں انہوں نے بڑی مدد کی ہے آپ کپتان گلاڈس ٹن کو بھی جانتے ہیں جو بمبئی اسکول آف آرٹ کے صدر ہیں اور جنہوں نے پند ونصیحت اور عملی مثال سے اس بات کی کوشش کی ہے کہ نقاشی کی ہندوستانی طلبہ کو ترغیب دلائی جائے کہ وہ اپنے نقاشی کے اعلیٰ تخیلات کے لئے اجنٹا کے نقش ونگار کا مطالعہ کریں۔ یہ دونوں حضرات میرے دوست ہیں۔ اور ان دونوں نے ہم زبان ہو کر یقین دلایا ہے کہ نقاشی کے وہ عطیات۔ خصوصاً خط وخال کی دل فریبی کا ملکہ ہندوستانی طلبہ میں پوشیدہ ہیں اور یہی وہ عطیے ہیں جن سے اجنٹا کی دیواری نقاشیاں ظہور میں آئی ہیں۔ ہندوستان سے میں بدھ مت کے مفقود ہونے کے ساتھ ہی یہ فن بھی مٹ گیا۔ یہ معلوم کرنا کس قدر ضروری،

کہ وہ کیا سماجی، سیاسی اور تعلیمی حالات تھے جنہوں نے ان گراں بہا عطیات کے عملی اظہار کو یک لخت روک دیا۔ پھر مغلوں کے زمانہ میں وہ کیا اسباب تھے کہ یہی خداداد ملکہ ننھی ننھی تصویروں کی نقاشی میں جلوہ گر ہوا گو یہ صورت اجنٹا والی نقاشی کی طرح دل کش نہ تھی سب سے آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب کن حالات کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے جن سے ان عطیات کا پورا پورا اظہار ہو اور پھر فنون لطیفہ کی دنیا میں ہندوستان کو اپنا پرانا رتبہ حاصل ہو۔ مجھے روز بروز اس بات کا یقین واثق ہوتا جاتا ہے کہ جن قوتوں کے بل پر ہندوستان کی وقعت کا سکہ مغربی دنیا کے دل پر بیٹھے گا اور قومی وقار کے ساتھ برطانوی شاہنشاہی میں ہندوستان کو وہ رتبہ ملے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ ان قوتوں میں کی ایک زبردست قوت یہ بات بھی ہوگی کہ مغرب روز افزوں طور پر ہندوستانی فنون لطیفہ اور کلچر کی شانداری اور بزرگی کو تسلیم کرتا جائے یہ ایسے مسائل ہیں کہ کوئی نقاشی کا مدرسہ انہیں حل نہیں کرسکتا۔ اس وجہ سے کہ نقاشی کے مدرسہ کا بڑا کام یہ ہے کہ نقاشی کے عملی مسائل اور نقاشی کے نمونوں کی پیداوار کی نگہداشت کرے۔ یہ مسائل سوچنے والے دماغ — یعنی جامعہ کے لئے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ جامعہ نقاشی کی تعلیم کے وہ فرائض بھی اپنے ذمہ لے لے جو اعلیٰ ماہرین فن کا ہی حصہ ہیں۔ لیکن مدرسہ نقاشی کے صدر کو جامعہ کی مجالس میں بہ لحاظِ عہدہ جگہ ملنی چاہیئے تاکہ فنِ لطیفہ کا عملی پہلو سے یا اعلیٰ نصب العین سے جدا نہ ہونے پائے۔ جامعہ کا کام یہ ہوگا کہ فنِ لطیف کے اعلیٰ ترین مقاصد کو نظروں سے دور نہ ہونے دے اور اس بات کا خیال رکھے کہ نقاشی کے مدرسے اعلیٰ فنی مطمحِ نظر سے گر کر محض اس کام کے رہ جائیں کہ نقشہ کشی (ڈرائینگ) کے معلموں کو تربیت دیا

کریں۔ معلموں کے تربیتی مدرسوں کی نوبت کو نہ پہونچنے پائیں مدارس نقاشی کے اس طرح اپنے رتبہ سے نہ گرنے کا یقیناً کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا جب تک ہاویل، برسی براون گلاڈس ٹن سالومن یا گنگولی جیسے ارباب فن ان کے صدر ہیں۔

مدارس نقاشی کی طرح میں بھی نہیں چاہوں گا کہ جامعہ مدرسہ انجنیری یا مدرسہ زراعت کو راست اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن میری یہ آرزو ضرور ہے کہ ان مختلف درسگاہوں کے قائم مقام جامعہ کی مجالس میں جگہ پائیں تاکہ تعلیمی میدان کا ہر عملی اور نظری گوشہ جامعہ جیسی فاضل اور اپنے خاص دائرہ میں سب سے افضل ــــ جماعت کی معمولی ذہنی نظر سے دور یا پوشیدہ نہ رہے۔

سائینس۔ سائینس کے بارہ میں مجھے زیادہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں علم کے اس رُخ پر ہمیں ترقی اور تحقیق کی جتنی شدید ضرورت ہے اس کو سب لوگ اب تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوستان نے سائینس کے میدان میں خصوصاً علاجیات اور نفسیات میں جن امر کا اضافہ کیا ہے اُن کی تحقیق ضروری ہے۔ ساتھ ہی ان عملیات کیمیائی کو دوبارہ دریافت کرنا ہے جس کو اب بھلا دیا گیا ہے۔ لیکن جن کے وجود کا پتہ ہندوستان کی قدیم صنعتوں اور فنون لطیفہ کے مطالعہ سے چلتا ہے یہ سب اُمور ہندوستانی جامعات کے شعبۂ سائینس کی سرگرمیوں کا نہایت مناسب اور سودمند میدان ثابت ہوں گے۔

سائینس کی تعلیم کے بارہ میں مجھے ایک تنبیہی آواز بھی کان میں ڈالنی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سائینسی تحقیق کے ایسے مدارس قائم کرنے کا رجحان بڑھتا جاتا ہے جو جامعہ سے بے تعلق اور خودمختار رہتے ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کی بے تعلقی جامعہ اور اُن مدارس دونوں کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ جامعہ سے جس حد تک تحقیق اور اُس کے ذرائع دُور

کر دیئے جائیں گے اس حد تک جامعہ اپنے کام کے زیادہ اعلیٰ اور تحقیقی رخ میں کمزور پڑتی جائے گی۔ دوسری طرف جامعہ کی علم پرور فضا سے تحقیقی مدارس بے تعلق ہو جائیں گے اور ان کا مطمحِ نظر تنگ اور اُن کے مسائل حل طلب اور کام کا میدان محدود ہو جائے گا میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر جامعہ ایگ ری کل چرل انس ٹی ٹیوٹ اسی پیمانہ پر جیسا کہ پوسا میں ہے یا کلکتہ کا سا مدرسہ ٹراپی کل مے ڈیشن یا بنگلور والے انس ٹی ٹیوٹ کی سی علمی تحقیق گاہیں اپنے آپ سے ملحق کرے۔ میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس طرح کی سب تحقیق گاہیں بجائے اس کے کہ اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیٰحدہ رکھیں کسی نہ کسی ہندوستان کی جامعہ سے متعلق ہو جائیں اور ان میں ہندوستان کے ہر حصہ کے طلبہ شریک ہو سکیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ مرورِ زمانہ کے بعد ہر ہندوستانی جامعہ کسی نہ کسی خاص فن کا مرکز بن جائے گی اور اسی اپنی خاص علمی شاخ اور تحقیقی میدان میں شہرت حاصل کرے گی۔

تخلیقی کام

جن مسائل کی تحقیق کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ان کا لازمی طور پر ہمارے ہاں کے معاشیاتی مسائل پر اثر ہوگا۔ یہ معاشیاتی مسائل مال گزاری اور مالی اور آخر میں چل کر ہمارے سیاسی اور سماجی مسئلوں پر اثر ڈالیں گے۔ اس طرح ہندوستانی جامعات کا کام جو اولاً بیشتر تجدیدی ہوگا — یعنی جو کام کی باتیں ملک میں پہلے تھیں لیکن اب تباہ یا ناپید ہو گئی ہیں۔ ان کو پھر زندہ کرنا۔ یہ تجدیدی کام ساتھ ہی ساتھ بہترین اور اعلیٰ ترین معنوں میں تخلیقی کام بھی ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد

جوش انگیز داستانِ ماضی اور اس کی منزلِ مقصود قابلِ ناز اور قومی قوت کا مستقبل ہوگی ہندوستان اب کسی عہدِ پارینہ کے حوالی کی طرف لوٹ نہیں سکتا۔ خواہ یہ تغیر بھلا ہو یا برا تجربہ اور اقوام کے تصادم نے ہمیں بدل دیا ہے۔ اب اس کا انحصار بیشتر ہمیں پر ہے کہ اس بات کا تصفیہ کریں کہ یہ تغیر ہمارے وطن کے لئے آخر میں چل کر بھلا ثابت ہو یا برا ہم جس زمانے میں زندگانی کر رہے ہیں اس کے مناسب حال نئے نئے مسائل کا ہمارے سامنے آنا اور ہمارا ان مسائل کو حل کرنا ضروری ہے۔

تعلیمِ نسوان

ان مسائل میں سے صرف ایک کو لیجئے ـــ مسئلہ تعلیم نسوان میرا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ آج کل ہندوستان کی شدید ترین ضرورت یہ ہے کہ خاتونوں کو تعلیم دی جائے ایک غیر تعلیم یافتہ ماں پڑھے لکھے بچہ کے لئے ادھوری ماں ہوتی ہے۔ ہندوستان کی قوت پاک خیالی اور اخلاص مندی میں من حیث القوم نسوانی دنیا کے تعلیم یافتہ ہونے سے جو اضافہ ہوگا۔ اس کا اندازہ بھی ممکن نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اندھے پن کے ساتھ نسوانی تعلیم میں یورپ کی تقلید کریں یا ایک تعلیمی نظام ایسا معرض وجود میں لائیں جو ہماری روایات اور ہمارے ملک کی ضرورتوں کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہو مجھے روز بروز اس بات کا احساس ہوتا جاتا ہے کہ عموماً جو تعلیم ہندوستانی لڑکیوں کے مدرسہ میں دی جاتی ہے وہ کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے اس لئے کہ اس سے ہندوستانی نسوانیت کے بہترین جوہر ابھرتے نہیں۔ موجودہ تعلیم میں ہندوستان کی گذشتہ بڑی نامور خواتین کی زندگانی اور کارناموں، ہندوستانی مستورات کے روحانی لگاؤ جس کے لئے

ان کی روح تڑپتی ہے۔ اور اُن ہندوستانی گھروں کی خاص معاشیات کا جن کی وہ ایک دن ملکہ بنتی ہیں کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی جدید تعلیم یافتہ ہندوستانی ماں خصوصاً ایسی صورت میں کہ قوی خاندانی روایات اس کی روک تھام نہ کریں جس گھر کی گھروالی بنتی ہے اس کو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر سا بنا دیتی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ گھر ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے ہندوستانی رہے۔ البتہ یورپی کلچر کی بہت سی باتوں کو سچ مچ جذب کر کے اپنے آپ کو زیادہ قیمتی بنا لے۔ یہ نہ ہو کہ یورپ کی باتوں کا ہلکا اور سطحی رنگ لے لے اوپر چڑھا لے۔

ان اقتدارات کے ملتے ہی جو میں جامعہ کے تفویض کرنا چاہتا ہوں، جامعہ کو اس بڑے مسئلہ سے فوراً دست و گریباں ہو جانا پڑے گا سچ یہ ہے کہ میں ان اقتدارات کے بغیر بھی اس بات کا آرزومند ہوں کہ جامعہ اس زبردست معاملے میں پبلک رائے کی اب بھی دانش مندانہ رہبری کرے۔ جس تعلیمی کمیشن کی میں نے سفارش کی ہے اس کو اپنے دیگر مضامین دریافت طلب میں۔ اس مسئلہ کو بھی شامل کرنا ہوگا اور جس وقت اس بارے میں یہ کمیشن تحقیقات کرے گی تو اس وقت اپنے ارکان میں صاحب الرائے ہندوستانی خواتین کو بھی داخل کرنا پڑے گا تاکہ کمیشن کی رائے اس خصوص میں بھی وقیع اور قابل تسلیم ہو جائے۔

جب جامعہ اپنے دائرہ اثر میں سوچنے والے دماغ کی حیثیت حاصل کر لے گی تو پھر اس طرح کے نئے مسائل رد و قدح اور حل کے لئے اور نئے تخلیقی کام اس کے سامنے آجائیں گے۔

ایکا۔ ہندوستان کو جس چیز کی مسلمہ طور پر نہایت شدید ضرورت ہے اور جس کے پیدا کرنے

کی جامعہ خاص صلاحیت رکھتی ہے ـــ وہ چیز اتحاد ہے ایسے لوگ موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ آج کل اتحاد کے پہلو سے ہماری حالت پہلے سے بدتر ہے میرا اس خصوص میں جو پہلو ہے وہ اس قدر مایوس کرنے والا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اپنی ساری تاریخ کے دوران میں کبھی اتحاد کے اتنے قریب نہیں تھے جتنے کہ آج کل ہیں۔ اس صورتِ حال کے لئے اور چیزوں کے علاوہ جیسا کہ بہت سے اربابِ رائے کا خیال ہے۔ ہم بیشتر اسی چیز کے رہینِ منت ہیں جس کو میں نے موجودہ تعلیمی نظام کا ایک زبردست نقص بتلایا ہے یعنی سارے ہندوستان کے لئے ایک پرائی زبان کا وسیلہ تعلیم قرار دیا جانا۔ اگر مجھے اس کا گمان بھی ہوتا کہ دیسی زبانوں کو اس حیثیت کے دینے سے جس کی وہ مستحق ہیں ہم نے اب تک اتحاد کی طرف جو پیش قدمی کی ہے وہ سب ہاتھ سے جاتی رہے گی تو میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ دیسی زبانوں کو وسیلہ تعلیم گردانے کے مسئلہ کو پیش اور اس کی تائید کرنے میں ہچکچاہٹ ہوتی اب جتنا کچھ اتحاد موجود ہے اس کے بھی نہ ہونے کی صورت میں جو کچھ میں نے جامعہ کے متعلق خیالات ظاہر کئے ہیں وہ محض ایک خوابِ پریشان اور ہندوستان کا آئندہ ایک زبردست قوم بننا ایک خالی خولی ڈھکوسلہ رہ جاتا ہے لیکن میں اس بات کو نہیں مانتا کہ ہماری دیسی زبانوں کو وسیلہ تعلیم بنانے سے ہم بہ حیثیت تعلیم رجعت قہقری کریں گے۔ اب ہم اپنی تاریخ کے تلخ سبق حاصل کر چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہم میں پھوٹ کے آثار نمایاں ہیں۔ جن سے ہمارے وطن کی ترقی کے ہوا خواہ اور ہندوستان کے شاندار مستقبل پر اعتماد رکھنے والے دوستوں کو بھی بے چینی اور تشویش ہوتی ہے۔ لوگ موجودہ افسوس ناک فسادوں کے اسباب مختلف بیان کرتے ہیں لیکن اصلی سبب جو سارے فساد کی جڑ ہے وہ محض جہالت ہے

جہالت کے برخلاف علم ایکا پیدا کرتا ہے یہی وجہ تھی کہ رسول عربی (صلعم) نے نوع انسان کو جو پیغام دیا وہ ایکے کا پیغام تھا۔ اور اس برگزیدہ ہستی نے علم کی ضرورت پر اس قدر زور دیا یُوزَنُ یَومَ الْقِیَامَۃِ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ بِدَمِ الشُّھَدَاءِ قیامت کے دن علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے تولی جائے گی "خالق کی کائنات کا ایک ساعت کا مطالعہ سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے"

ہماری جامعوں میں ہندو اور مسلمان اور سکھ اور پارسی، عیسائی اور یہودی ایک ہی جگہ اکھٹے ہوتے ہیں اور وہ اس جگہ حق کے طالب بن کر اور جاہلوں کی تنگ خیالیوں کو چھوڑ کر آتے ہیں۔ یہ لوگ خلوص اور صداقت کے ساتھ اور اس نیت سے کہ کل نوع انسان کی بھلائی ہو حق کے جویا ہوتے ہیں اور یہی حق کی طلب ان کو۔ حالاں کہ وہ اس بات سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس ذاتِ باری کے قریب لے جاتی ہے جو ساری کائنات کا مالکِ لاشریک اور نفسِ انسانی کا رحیم و کریم خالق اور علم اور روشنی کا اصلی منبع ہے۔

جامعہ کی علمی اور ذہنی فضا قومی ایکے کی زیادہ ضامن ہو سکتی ہے بمقابلہ ایسی جگہوں کے جہاں فرقہ بندی کی عضو بند صورت میں تفرقہ دوامی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور جہاں آزادانہ رائے کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ جامعہ کی حیثیت کو اس قدر بلند کرنا ضروری ہے کہ اس کی عقل و دانش کی آواز فرقہ پروری کی غل پکار کے باوجود لوگوں تک پہونچ سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ قوم دانش مند ہے جو دانش مندی کا بول بالا کرے۔

میری اپیل آپ سے یہی ہے کہ اس طرح کا دلوں کا اتحاد قائم کیا جائے جس کی بنیاد یہ ہو کہ مختلف تمدنوں اور نسلوں نے اس ہمارے وطن کو جن کلچر کی چیزوں سے

جامعہ عثمانیہ

۱- اراکین مجلس ... [illegible]

[illegible]